

درسِ قرآن

مؤلف

ڈاکٹر صاحبزادہ ابوالخیر محمد زبیر دام ظلہ العالی

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور۔کراچی۔پاکستان

درسِ قرآن

مؤلف

ڈاکٹر صاحبزادہ ابو الخیر محمد زبیر

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور - کراچی - پاکستان

نام کتاب	درس قرآن
مصنف	ڈاکٹر صاحبزادہ ابوالخیر محمد زبیر
تاریخ اشاعت	اپریل 2010ء
ناشر	ضیاء القرآن پبلی کیشنز
تعداد	ایک ہزار
کمپیوٹر کوڈ	UQ24
قیمت	-/120 روپے

ملنے کے پتے



فہرست مضامین

پیش لفظ

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اس زمانہ میں بعض ایسے گروہ پیدا ہو گئے ہیں جو قرآن وحدیث کے خلاف نئے نئے نظریات وافکار ایجاد کر کے مسلمانوں میں افتراق وانتشار پیدا کر رہے ہیں اور اس طرح اسلام کو کمزور کرنے کی یہودی اور صیہونی سازشوں کے آلہ کار بن رہے ہیں۔ ظاہر ہے ایک مسلمان قرآن وسنت کے خلاف ایسی باتوں کو کب قبول کر سکتا تھا چنانچہ اس کے لئے ایک سازش تیار کی گئی جس کے تحت قرآنی آیات اور احادیث کے غلط معانی بیان کر کے اس کے ذریعہ اپنے غلط اور باطل نظریات کو لوگوں کے سامنے پیش کیا جانے لگا۔ تا کہ عوام میں ان باطل افکار کو پذیرائی مل سکے۔ ایک سیدھا سادہ عام مسلمان جس کا دل قرآن وحدیث کی محبت سے لبریز ہوتا ہے لیکن وہ قرآن وحدیث کی زیادہ معلومات نہیں رکھتا اس فریب اور دھوکہ میں آ کر ان باطل عقائد اور نظریات کو قرآن وحدیث کا حقیقی منشاء اور حکم سمجھنے لگا اور اس پر عمل کر کے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضا اور جنت کی امید لگا کے بیٹھ گیا۔ لیکن اسے کیا پتہ کہ یہ عقائد و نظریات جنت کی طرف نہیں بلکہ جہنم کی طرف لے جا رہے ہیں، یہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضا نہیں بلکہ اس کے غضب وعتاب کا باعث بن رہے ہیں۔

اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے میں نے اس قسم کے عقائد اور نظریات وافکار کے متعلق قرآن سے آیات منتخب کر کے "درس قرآن" کے نام سے اس کتاب میں یکجا کر دی ہیں۔ جس میں ہر آیت مبارکہ کا ترجمہ، اس کی مختصر سی تفسیر، اس سے جو فائدہ اور سبق ہمیں ملتا ہے اس کو ذکر کر دیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس مسئلہ اور عقیدہ کے متعلق قرآن ہی کی آیات اور احادیث پیش کر کے بعض گروہوں نے جو غلط فہمیاں پیدا کر دی تھیں ان کی طرف بھی مع

ان کی دلیل کے اشارہ کر کے الحمدللہ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کا مختصر سا جواب بھی تحریر کر دیا ہے تا کہ لوگ گمراہی کے گڑھے میں گر کر جہنم کا ایندھن بننے سے بچ جائیں اور قرآن وحدیث کا بتایا ہوا سچا وسیدھا اور صحیح راستہ اختیار کر کے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضا اور خوشنودی سے ہمکنار ہو جائیں۔

اللہ تعالیٰ میری اس کوشش کو اپنی اور اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں شرف قبولیت سے سرفراز فرمائے اور اس کو اپنے بندوں کی ہدایت کا ذریعہ بنا کر میرے گناہوں کی بخشش اور اپنے بے پایاں رحمت کا بہانہ بنا دے۔

آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ اجمعین

عاصی وخطار، رحمت رب کا امیدوار

ابوالخیر محمد زبیر

آزاد میدان ہیرآباد، حیدرآباد

27 رمضان المبارک 1417 ہجری

5 فروری 1997ء بروز جمعرات

آیت نمبر (1)

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿۸۷﴾ (النساء)

''اللہ ہے اس کے سواء کوئی لائق عبادت نہیں۔ وہ ضرور تمہیں جمع کرے گا قیامت کے دن جس میں کوئی شک نہیں اور کون ہے جس کی بات اللہ کی بات سے زیادہ سچی ہو''۔

فائدہ

اس آیت مبارکہ میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ سچا کوئی نہیں کیونکہ دنیا میں اگر چہ بہت سے لوگ سچے ہیں وہ جھوٹ بولتے نہیں لیکن جھوٹ ''بول تو سکتے ہیں''۔ ان کا جھوٹ بولنا ممکن تو ہے وہاں جھوٹ کا امکان تو پایا جاتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ سچا ہے اور وہ اتنا سچا ہے کہ وہاں جھوٹ کا امکان ہی نہیں۔ اس کا جھوٹ بولنا ممکن ہی نہیں ہے، اگر اس کا جھوٹ بولنا ممکن ہو تو اس میں اور ہم میں کیا فرق رہے گا......؟ کیونکہ اولیاء وصوفیاء بھی جھوٹ نہیں بولتے اس ہی فرق کو ظاہر کرنے کے لئے قرآن نے فرمایا کہ اللہ سے زیادہ کوئی سچا نہیں کہ بعض لوگ اگر چہ جھوٹ نہیں بولتے لیکن وہاں جھوٹ کا امکان ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات میں جھوٹ کا امکان بھی نہیں۔ اس کا جھوٹ بولنا محال اور ناممکن ہے۔

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے آپ کو مسلمان بھی کہتے ہیں۔ قرآن وحدیث اور اس آیت پر بھی ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ...... ''اللہ تعالیٰ جھوٹ بول سکتا ہے''...... حالانکہ امام رازی جیسے عظیم مفسر اور محقق اپنی کتاب تفسیر کبیر میں اسی آیت کے تحت فرماتے ہیں کہ ''عقلاء'' کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ کذب اور جھوٹ سے بالکل پاک اور منزہ ہے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ کذب اور جھوٹ اللہ تعالیٰ کے لئے جائز ہے وہ بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ

کسی مسلمان کو یہ جائز نہیں کہ وہ خدا پر جھوٹ کا گمان بھی کرے کہ ایسا کرنا ایمان سے خارج کر دیتا ہے۔ (تفسیر کبیر، ج5 ص179)

اور عقل بھی یہی کہتی ہے کہ جھوٹ بولنا ایک عیب ہے اور نقص ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ ہر عیب اور نقص سے پاک ہے۔ اس کی ذات میں کسی عیب کا پایا جانا محال ہے۔ لہٰذا کذب اور جھوٹ جیسے بدترین عیب کا پایا جانا بھی محال ہوگا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اللہ جھوٹ بول سکتا ہے وہ سخت ترین اپنے رب کی بے ادبی اور گستاخی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسی بے ادبی اور ایسے بے ادب گروہ سے بچائے اور محفوظ رکھے۔ ایسے لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰیٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۲۱ (الانعام)

"اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا اس کی آیتیں جھٹلائے بے شک ظالم فلاح نہیں پائیں گے"۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو اللہ کے لئے جھوٹ ثابت کرتے ہیں وہ بہت بڑے ظالم ہیں اور ظالموں کو فلاح نہیں ملتی۔ لہٰذا اللہ کے لئے جھوٹ ثابت کرنے والے بھی فلاح نہیں پائیں گے۔

آیت نمبر (2)

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَكَفٰی بِرَبِّكَ وَكِیْلًا ۝۶۵

"(اے شیطان) بے شک جو میرے خاص بندے ہیں ان پر تیرا کچھ قابو نہیں اور تیرا رب کافی ہے حفاظت کرنے کو"۔ (بنی اسرائیل)

فائدہ

اس آیہ مبارکہ میں "عبادی" یعنی اللہ کے خاص بندوں سے مراد انبیاء اور اولیاء ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے متعلق شیطان سے فرما رہا ہے کہ تو دوسرے لوگوں کو گمراہ کر لے گا لیکن جو

میرے خاص بندے انبیاء اور اولیاء ہیں ان پر تیرا بس نہیں چلے گا اور تو ان کو گمراہ نہیں کر سکے گا، کیونکہ وہ تو میری حفاظت میں ہیں۔ میں ان کی حفاظت کے لئے کافی ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء کرام گناہوں سے معصوم ہیں اور اولیاء کرام گناہوں سے محفوظ ہیں، کیونکہ انسان سے گناہ شیطان کے بہکانے کی وجہ سے سرزد ہوتے ہیں۔ جب شیطان ان کو بہکا ہی نہیں سکے گا تو گناہ بھی ان سے ظاہر نہیں ہو سکتے۔ اسی کو "عصمت انبیاء" کہتے ہیں۔ یعنی اہل سنت و جماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ اعلان نبوت سے پہلے اور اعلان نبوت کے بعد کسی زمانہ میں کسی وقت بھی کسی نبی سے کوئی گناہ کبیرہ سرزد نہیں ہوسکتا اور نہ گناہ صغیرہ عمداً سرزد ہوسکتا ہے۔

ان گناہوں کا صادر ہونا نبی سے محال اور ناممکن ہے۔ اسی کو معصوم ہونا کہتے ہیں۔ جب کہ محفوظ کے معنی یہ ہیں کہ گناہ ہوتو سکتے ہیں لیکن ان سے سرزد ہوتے نہیں ہیں۔ یہ اولیاء کی شان ہے۔ جب کہ نبیوں کی شان یہ ہے کہ ان سے گناہ صادر ہی نہیں ہو سکتے۔ ان سے گناہوں کا صادر ہونا ناممکن اور محال ہے۔ لہٰذا نبی گناہوں سے معصوم ہوتا ہے اور ولی گناہوں سے محفوظ ہوتا ہے۔ نبی کے لئے گناہوں سے معصوم ہونے کا عقیدہ رکھنا ضروری ہے۔ اگر کوئی یہ عقیدہ نہ رکھے اور معاذ اللہ نبی کو گناہ گار بتائے تو وہ کافر ہو جاتا ہے۔ قرآن کی بہت سی آیات سے نبیوں کا معصوم ہونا اور گناہوں سے پاک ہونا ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد رب العزت ہے لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ کہ میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا (سورہ بقرہ) نبوت سے بڑا عہد کیا ہوگا جب انبیاء کرام نے نبوت کے عہد کو پالیا تو اس ارشاد ربانی کے مطابق اب وہ ظالم ہرگز نہیں ہو سکتے۔ یعنی گناہ گار نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ گناہ کرنے والا اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے وہ ظالم ہوتا ہے۔ جب کہ انبیاء عہد نبوت پانے کے باعث ظالم نہیں۔ لہٰذا وہ گناہ گار بھی نہیں۔ عقل بھی یہ کہتی ہے کہ نبی کا معصوم ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ نبی اللہ کی طرف سے لوگوں کو ہدایت کرنے کے لئے اور سیدھا راستہ دکھانے کے لئے آتا ہے تو اگر معاذ اللہ نبی سے گناہ سرزد ہو سکتے ہوں تو وہ خود ہدایت پر نہیں ہوا۔

جب وہ خود معاذ اللہ راہ راست پر نہیں تو دوسروں کو راہ راست پر کیا لائے گا......؟ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ وہ گناہوں سے پاک اور معصوم ہوتا ہے......البتہ جہاں قرآن پاک میں یا بعض احادیث میں "ذنب" یعنی گناہ کی نسبت اللہ تعالیٰ یا خود نبی نے اپنی طرف فرمائی ہے اس سے مراد یہ ظاہری گناہ نہیں ہیں۔ بلکہ ترک اولیٰ مراد ہے اور وہ فعل چونکہ انبیائے کرام کے بلند مرتبہ کے لحاظ سے کم درجہ کا تھا اس لئے اس کو گناہ کے لفظ سے تعبیر کر دیا گیا۔ حالانکہ حقیقت میں وہ گناہ نہیں تھا اور انبیاء کرام نے بعض مقامات پر گناہ نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے رب کے سامنے ان ہی ترک اولیٰ امور پر کسر نفسی اور تواضع اختیار کرتے ہوئے استغفار فرمایا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ حقیقت میں گناہ تھے یا ہم بھی ان کو گناہ گار کہنے لگیں۔ اگر کسی نے ایسا کیا تو وہ کافر ہو جائے گا۔

آیت نمبر (3)۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى
وَاسْتَكْبَرَ ٭ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾ (بقرہ)

"اے محبوب یاد کیجئے جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے وہ منکر ہوا اور اس نے تکبر کیا اور کافر ہو گیا"۔

فائدہ

قرآن کریم کی اس آیت مبارکہ سے چند فوائد اور سبق ہمیں حاصل ہوئے۔ مفسرین فرماتے ہیں وَ اِذْ میں اذکر کا لفظ محذوف ہے۔ آیت کے معنیٰ ہیں کہ اللہ نے فرمایا "اے محبوب یاد کیجئے" یاد اسی کو دلایا جاتا ہے جس کو پہلے سے اس بات کا علم ہو اور وہ شے اور واقعہ اس کا دیکھا ہوا ہو۔ یہاں اللہ تعالیٰ اپنے محبوب حضور سرور دو جہاں ﷺ کو آدم علیہ السلام کو ملائکہ کے سجدہ کرنے کا واقعہ یاد دلا رہا ہے جو ابتدائے آفرینش کا واقعہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ واقعہ اور جو کچھ ماضی میں واقعات ہو چکے ہیں حضور ﷺ کی نگاہ ان سب پر بھی تھی اور ماضی کا کوئی واقعہ کوئی شی کوئی بات حضور ﷺ سے مخفی نہیں تھی، بلکہ ماضی حال

اور استقبال یعنی ابتدائے آفرینش سے لے کر قیامت تک کی ہر شی کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا فرمادیا تھا۔

اسی لئے صاحب تفسیر روح البیان لکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چونکہ اللہ تعالیٰ کی سب سے پہلی مخلوق ہیں اس لئے جو کچھ اللہ نے پیدا فرمایا ان سب کا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مشاہدہ فرمار ہے تھے۔ ارواح کو، نفوس کو، اجسام کو، نباتات و جمادات کو، حتیٰ کہ حضرت آدم کے پیدا ہونے کو، فرشتوں کے ذریعہ ان کی تعظیم کرانے کو، جنت سے ان کے علیحدہ ہونے کو اور پھر ان کے توبہ کرنے کو، ابلیس کی پیدائش اور جو کچھ اس پر گزرا الغرض ہر چیز کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ نور جس کو اللہ تعالیٰ نے ساری مخلوقات سے پہلے پیدا فرمایا وہ ہر شی کو اور ہر واقعہ کو دیکھ رہا تھا۔ اسی لئے قرآن میں حضور سے کہیں حضرت آدم کے واقعہ کے لئے فرمایا کہ اس کو یاد کیجئے تو کہیں ''واذقال موسیٰ لقومه'' فرما کے حضرت موسیٰ کے واقعہ کو یاد دلایا۔ معلوم ہوا تمام واقعات حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ہو رہے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سب چیزوں کا علم تھا۔
(تفسیر روح البیان پارہ 26 سورہ فتح)

اس لئے تفسیر کی سب سے معتبر کتاب تفسیر خازن میں لکھا ہے کہ اَلرَّحْمٰنُ ۙ﴿۱﴾ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ؕ﴿۲﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۙ﴿۳﴾ عَلَّمَهُ الْبَیَانَ ﴿۴﴾ میں انسان سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی ہے اور اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ رحمٰن نے انسان کامل یعنی حضور سرور دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ما کان وما یکون یعنی جو کچھ ہو چکا اور جو کچھ ہونے والا ہے تمام اگلے اور پچھلے امور کا بیان سکھا دیا۔ (تفسیر خازن۔ سورۂ رحمٰن)

☆ اس آیت سے دوسرا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ ابلیس کتنا بڑا عالم اور کتنا بڑا عابد تھا لیکن اس کو حضرت آدم کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا جو انتہائی عاجزی و انکساری اور کسی کی انتہائی تعظیم کرنے کا نام ہے۔ لیکن اس نے سجدہ سے انکار کر دیا اور نبی کی تعظیم نہ کی تو اس کا سارا علم اور ساری عبادت اس کے منہ پر ماردی گئی اور اس کو رب نے اپنے در سے دھتکار دیا اور فرمادیا کہ وہ کافر ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ اللہ کے یہاں سب سے اہم چیز اس کے پیارے

بندوں کا ادب و احترام ہے۔ کوئی کتنا ہی بڑا موحد کیوں نہ ہو کتنی ہی عبادت کیوں نہ کرتا ہو لیکن اگر اس کے پیاروں کا ادب نہیں کرتا تو نہ اس کا علم مقبول ہے اور نہ اس کی کوئی عبادت مقبول ہے۔ توہین کے باعث اس کی سب چیزیں بے کار ہیں۔ وہ عالم اور عارف ہونا تو درکنار وہ مسلمان بھی نہیں رہتا بلکہ کافر ہو جاتا ہے۔ لہٰذا انبیاء اور اولیاء کا ادب اختیار کرنا چاہیئے۔ ان کی تعظیم کرنی چاہیئے اسی میں اللہ کی رضا مضمر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کو قرآن میں سات بار بیان کر کے اس کی اہمیت بیان کر دی کہ خبردار نبی کی تعظیم سے ذرا بھی غافل نہ ہونا۔ ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا انجام بھی ابلیس جیسا ہو جائے۔

☆ یہاں یہ بات بھی پتہ چل گئی کہ خواہ کوئی کتنا ہی بڑا عالم، پیر، مفکر اور محقق اور عابد و زاہد ہی کیوں نہ ہو ہمیں اس کے علم اور زہد و عبادت سے مرعوب نہیں ہونا چاہیئے اور نہ اس سے دھوکہ کھانا چاہیئے۔ سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ یہ شخص بزرگ اور عالم انبیاء و اولیاء کا ادب کرتا ہے یا نہیں۔ اگر اس کی تحریر یا تقریر یا گفتگو میں کہیں بھی ذرا سی اللہ کے پیاروں کی بے ادبی کی بو آئے تو فوراً سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ شیطان کی ذریت میں سے ہے۔ یہ اللہ کا مقبول بندہ نہیں بلکہ اس کے پیاروں کی بے ادبی کے باعث اس کے در سے دھتکارا ہوا شیطان ہے۔ اگر اس میں ادب نہیں تو اس کا علم اور زہد و عبادت سب بیکار ہے۔ نہ یہ اقتداء کے لائق ہے اور نہ احترام کے قابل۔

یہاں سے ایک یہ بات بھی پتہ چلی کہ تکبر اتنی بری چیز ہے کہ کفر تک لے جاتی ہے۔ شیطان نے تکبر کیا اور حضرت آدم کو تکبر سے سجدہ نہ کیا تو وہ کافر ہو گیا۔ اس کا سارا علم اور ساری عبادتیں رائیگاں چلی گئیں۔ لہٰذا تکبر سے بچنا چاہیئے اور کوشش کرنی چاہیئے کہ اپنے کسی قول سے کسی فعل سے کسی طرز و اداء سے کوئی تکبر و نخوت اور غرور کی بو نہ آنے پائے، کیونکہ قرآن میں آتا ہے کہ...... اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُتَکَبِّرِیْنَ...... اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ فرعون جیسے خدائی کے دعویٰ کرنے والے بڑے بڑے متکبرین کو اللہ تعالیٰ نے تباہ و برباد کر دیا۔ کہیں اس تکبر کی وجہ سے تم بھی تباہ و برباد نہ ہو جاؤ۔

☆ اس آیت سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام اشیاء کے ناموں کا علم عطا کر کے ملائکہ پر ان کی علمی برتری کا اظہار فرمایا اور اس کے بعد ملائکہ کو ان کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دیا اس سے ثابت ہوا کہ علم کو بڑی فضیلت حاصل ہے اور یہ وہ چیز ہے جس نے حضرت آدم کی ملائکہ پر برتری ثابت کر کے ان کو مسجود ملائکہ بنا دیا۔ لہٰذا اس میں اشارہ ہے اس طرف کہ تم بھی علم سے اپنے قلب کو روشن کرو تا کہ سارے جہاں کے قلوب بھی تمہاری طرف جھکیں۔ اسی مقام کو حدیث پاک میں بیان کیا گیا کہ عالم کے لئے دریا کی مچھلیاں بھی دعا کرتی ہیں۔ یہ اشارہ ہے اس طرف کہ علم کے باعث صرف انسان ہی نہیں بلکہ خدا کی ساری خدائی اس سے محبت کرنے لگتی ہے اور اس کی مطیع و فرمانبردار بن جاتی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس جو شخص پلک جھپکنے سے پہلے تخت بلقیس کو لے کر آ گیا تھا۔ اس کے متعلق بھی قرآن فرماتا ہے کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی امت کا وہ عالم تھا جس کو کتاب کا تھوڑا سا علم تھا۔ ...... قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْكَ طَرْفُكَ ...... گویا بتانا یہ مقصود تھا کہ جس کو تھوڑا سا کتاب کا علم آ گیا ہو اس کی طاقت کا یہ عالم ہے کہ زمین اور ہوا بھی اس کی اطاعت کر رہی ہے تو جو پوری کتاب کا علم حاصل کرے گا اس کی طاقت وقدرت کا کیا ٹھکانہ ہو گا۔

☆ اگر کوئی عاشق میلاد شریف کی محفل میں حضور ﷺ اور ان کے ذکر کی تعظیم میں کھڑا ہو جائے تو بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ مشرک ہو گیا۔ اس کا ایمان چلا گیا۔ لیکن اس آیت نے بتا دیا کہ اللہ کے پیاروں کی تعظیم کرنے سے ایمان نہیں جاتا بلکہ تعظیم نہ کرنے سے ایمان جاتا ہے۔ اللہ کے پیاروں کی تو یہ شان ہے کہ ان کی تعظیم سے ایمان جاتا نہیں بلکہ جس کے پاس ایمان نہ ہو اس تعظیم کی برکت سے اس کو ایمان مل جاتا ہے۔ دیکھئے جب جادوگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں جب میدان میں آئے تو انہوں نے حضرت موسیٰ کا صرف اتنا ادب کیا کہ ان سے پوچھ لیا...... اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِیَ وَ اِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِیْنَ...... آپ اپنا عصا پہلے ڈالتے ہیں یا ہم ڈالیں (پارہ 9) اللہ تعالیٰ نے اس ادب کی

وجہ سے ان کو دولت ایمان سے مالا مال کر دیا اور وہ سب حضرت موسیٰ کا معجزہ دیکھ کر ایمان لے آئے۔ تفسیر جمل اور صاوی نے اس نکتہ کو بیان فرمایا ہے اور مولانا روم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنے انداز میں اس کو بیان فرماتے ہیں۔

این قدر تعظیم دینِ شاں را خرید
و زمرے آں دست و پاہا شاں برید

آیت نمبر (4)

اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًاۙ لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُعَزِّرُوْهُ وَ تُوَقِّرُوْهُؕ وَ تُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِیْلًا (فتح)

"اے نبی بے شک ہم نے آپ کو مشاہدہ فرمانے والا خوش خبری دینے والا اور ڈر سنانے والا بنا کر بھیجا، تا کہ (اے لوگو) تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور رسول کی تعظیم و توقیر کرو اور صبح و شام اللہ کی پاکی بیان کرو"۔

فوائد

اس آیت مبارکہ سے چند فوائد اور سبق ہمیں حاصل ہوئے۔ سب سے پہلی اور اہم بات تو یہ ہے کہ اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے اپنے محبوب کو اطاعت کرنے والوں کے لئے خوشخبری سنانے والا اور نافرمانوں کیلئے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا۔ یعنی ہم نے ان کو دین اسلام کے احکامات دے کر بھیجا۔ اب اس دین اسلام کے بھیجنے کی تین وجہ بیان کی گئی کہ اس دین اسلام کے بھیجنے اور قرآن کے نازل کرنے کا مقصد صرف تین باتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لایا جائے اور دوسرا یہ کہ حضور ﷺ کی تعظیم و توقیر کی جائے اور تیسرا یہ کہ اللہ کی عبادت کی جائے۔ اس سے حضور اکرم ﷺ کے ادب و احترام کی اہمیت کا پتہ چلا کہ آپ کی تعظیم و توقیر دین اسلام کا مقصد اولین ہے۔ یعنی یوں کہیئے کہ دین کی روح اور ایمان کی جان ہے۔ بقول علامہ اقبال"

مغز قرآن روح ایمان جان دین
ہست حب رحمت للعالمین

جس کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ادب نہیں اس کے پاس نہ دین ہے نہ ایمان نہ توحید ہے نہ اسلام۔ خواہ وہ کتنا ہی عابد و زاہد کیوں نہ ہو۔ اگر تعظیم مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں تو کچھ نہیں۔ اسی لئے ابن تیمیہ نے لکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بے ادبی دین وایمان کے منافی ہے۔ جس نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعظیم کی اس نے تمام دین کو قائم کر دیا اور جس نے آپ کی توہین کی اس نے دین کو ساقط کر دیا اور گرا دیا۔ (الصارم ص 211)

☆ پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ادب واحترام کو دین وایمان کا مقصد اولین قرار دینے کے بعد وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ فرما کے امر کے صیغہ کے ذریعہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعظیم وتوقیر کرنے کا مسلمانوں کو حکم دیا جا رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعظیم وتوقیر فرض ہے۔ اگر کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ادنیٰ سی بھی گستاخی کر دی تو وہ ایمان سے نکل جائے گا۔ خواہ وہ کتنا ہی بڑا علامہ ہو محقق ہو عابد ہو یا زاہد ہو۔ اس کا علم اور عبادت اس کے کچھ کام نہیں آئے گا۔ رب کو اپنے محبوب کی ادنیٰ سی گستاخی بھی گوارا نہیں۔ اسی لئے دوسرے مقام پر قرآن میں نبی کا ادب سکھاتے ہوئے فرمایا گیا کہ اگر تم سے اتنی سی بے ادبی بھی ہو گئی کہ نبی کی آواز سے تمہاری آواز اونچی ہو گئی تو تمہارے سارے اعمال بے کار چلے جائیں گے۔ جتنی تم نے نیکیاں کی ہیں سب برباد ہو جائیں گی۔ معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ادنیٰ سی گستاخی بدترین کفر اور خدا کے سخت غضب اور ناراضگی کا باعث بنتی ہے۔

☆ اس آیت میں پہلے ایمان کا ذکر ہے پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعظیم وتوقیر کا اور آخر میں اللہ کی تسبیح وتقدیس یعنی اس کی عبادت کا۔ قرآن نے ان تینوں باتوں کو اس ترتیب سے ذکر فرما کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ پہلے ایمان ہونا چاہئے پھر تعظیم رسول ہو تو وہ کارآمد ہے اور مفید۔ اگر ایمان کے بغیر تعظیم رسول کی تو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ جیسے ہندو یا عیسائیوں اور انگریزوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں کتابیں لکھی ہیں۔ بہت سے اشعار لکھے ہیں۔ لیکن

چونکہ وہ حضور ﷺ پر ایمان نہیں لائے اس لئے ان کی اس تعظیم کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ دراصل دکھلاوے کی تعظیم ہے ورنہ اگر حقیقت میں ان کے دل میں حضور ﷺ کی تعظیم ہوتی تو ضرور اسلام لے آتے۔ پھر قرآن میں تعظیم رسول کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کا ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر پہلے تمہارے دل میں تعظیم رسول ہو گی تو اس کے بعد جو تم عبادت کرو گے اس کا فائدہ ہوگا اور وہ عبادت تمہاری مقبول ہوگی اور اگر بغیر تعظیم رسول کے تم نے عبادت کی تو اس عبادت کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ تمہارے منہ پر ماردی جائے گی۔ خواہ ساری زندگی عبادت اور تبلیغ میں گزارو اور لاکھوں کروڑوں روپے اللہ کی راہ میں خرچ کرو، لیکن یاد رکھنا اگر تعظیم رسول نہیں تو کوئی نیکی بھی تمہارے کام نہیں آئے گی۔ ثابت ہوا کہ اچھے اور نیک اعمال کی قبولیت کا دارومدار تعظیم مصطفیٰ ﷺ پر ہے۔

☆ اب سوال یہ ہے کہ حضور ﷺ کی کتنی تعظیم کی جائے......؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں مطلقاً فرمایا گیا ہے کہ حضور ﷺ کی تعظیم و توقیر کرو۔ اس میں کوئی قید نہیں لگائی گئی۔ لہٰذا اسلام میں جن چیزوں کو حرام قرار دے دیا گیا ہے۔ مثلاً سجدہ وغیرہ۔ اس کو چھوڑ کر ہر قسم کی تعظیم کرنے کا ہمیں حکم ہے۔ لہٰذا حضور ﷺ کی ذات و صفات کی تعریف کرنا، ان کی شان بیان کرنا، ان میں عیب نہ نکالنا، ان کے نام کی تعظیم کرنا کہ اس کو سن کر انگوٹھے چومنا، ان کے ذکر کی تعظیم کرنا کہ کھڑے ہو کر صلوٰۃ و سلام پڑھنا، ان سے نسبت رکھنے والی ہر شئی کا احترام کرنا، یعنی صحابہ و اہل بیت و اولیاء و صلحاء، مکہ مدینہ، مدینہ کے شجر و حجر، بلکہ اس کی خاک، الغرض ہر چیز کا ادب و احترام کرنا اس آیت کی رو سے ہر مسلمان پر ضروری ہو گیا۔ (لہٰذا جو محبت سے ان چیزوں کو آنکھوں سے لگاتا ہے اور ہونٹوں سے چوم کر ان کی تعظیم و تکریم کرتا ہے وہ دراصل حضور ﷺ کی تعظیم و تکریم کرتا ہے اور اللہ کے اس فرمان پر عمل کر کے اللہ کا پیارا بن جاتا ہے اور جو ان کا ادب و احترام نہیں کرتا وہ درحقیقت تعظیم رسول سے انکار کر کے غضب خداوندی کو دعوت دیتا ہے)۔

☆ بعض لوگ عاشقان مصطفیٰ ﷺ سے کہتے ہیں کہ تم تو حضور ﷺ کی تعریف

اورتوقیر میں بہت مبالغہ کرتے ہو۔ حد سے زیادہ بڑھادیتے ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم قرآن پر عمل کرتے ہیں، کیونکہ اس آیت میں وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ فرما کر حضور ﷺ کی تعظیم کرنے کا حکم دیا گیا۔ جب کہ حضرت عبداللہ ابن عباس اور قاضی عیاض و مبرد جیسے عظیم نحوی کے نزدیک تُعَزِّرُوْهُ کے معنی ہی یہ ہیں کہ ان کی تعظیم میں مبالغہ کرو۔ (شفاء شریف جلد 2 ص 29) دوسری بات یہ ہے کہ حضور ﷺ کے کمالات کی تو کوئی حد ہی نہیں جو تعریف کرو گے حد میں رہے گی، حد سے بڑھ ہی نہیں سکتی۔

آیت نمبر (5)

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا ۝ (الاحزاب)

"محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، بلکہ وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں"۔

فائدہ

اس آیت مبارکہ نے واضح طور پر بتادیا کہ آنحضرت ﷺ خاتم النبیین آخری نبی ہیں۔ آپ کے بعد کوئی نیا نبی نہیں آسکتا۔ آپ پر سلسلہ نبوت ختم ہوگیا۔ قرآن نے ایک دوسرے مقام پر اس کی وجہ بھی بیان فرمادی کہ اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (مائدہ: ۳) یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آج کے دن میں نے تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کردیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کردی اور تمہارے لئے دین اسلام پسند کرلیا۔ معلوم ہوا کہ جب دین اسلام مکمل ہوگیا اور اللہ کی نعمت تمام ہوگئی تو اب کسی نئے نبی کے ذریعہ کسی نئے دین کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ یہ اللہ کے آخری نبی کے ذریعہ آخری شریعت اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو عطا فرمائی ہے جو قیامت تک کے لئے ہے۔ اب اس تکمیل نعمت کے بعد نہ دوسری کوئی شریعت آئے گی نہ دوسرا کوئی دین آئے گا اور نہ کوئی دوسرا نیا نبی آئے گا......! اگر حضور ﷺ کے بعد کوئی شخص کسی قسم کے بھی یعنی ظلی بروزی، اصلی

عارضی کسی طرح کے بھی نبی ہونے کا دعویٰ کرے تو وہ جھوٹا اور مرتد ہے اور اس کے ماننے والے بھی مرتد اور کافر ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے ایک مقام پر فرمایا کہ...... اَنَا اٰخِرُ الْاَنْبِیَاءِ وَاَنْتُمْ اٰخِرُ الْاُمَمِ...... کہ میں آخری نبی ہوں اور تم سب سے آخری امت ہو۔

(ابن ماجہ ص 307)

یہ ایک اہم بات ذہن نشین کر لی جائے کہ آیہ مبارکہ اور احادیث میں جو آیا ہے کہ حضور ﷺ خاتم النبیین ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ آخری نبی ہیں اب آپکے بعد کوئی نیا نبی نہیں آئے گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ انبیاء سابقین جن کو حضور ﷺ سے پہلے نبوت ملی ہے وہ بھی نہیں آسکتے یا زندہ نہیں رہ سکتے۔ مثلاً قیامت کے قریب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمانوں پر سے زمین پر تشریف لائیں گے۔ حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق کتابوں میں آتا ہے کہ وہ بعض علماء کے نزدیک نبی ہیں اور آج بھی زندہ ہیں، لیکن یہ نبی اب حضور ﷺ کے زمانہ میں آئیں گے تو حضور ﷺ کے امتی بن کر رہیں گے اور حضور ﷺ کی شریعت پر عمل کریں گے۔ ان کا زندہ رہنا یا آسمانوں پر سے آنا حضور ﷺ کی ''ختم نبوت'' کے خلاف نہیں۔

اسی پر قیاس کر کے کوئی جھوٹا نبی اگر یہ کہنے لگے کہ جس طرح حضور ﷺ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آنے سے حضور ﷺ کی ختم نبوت میں کوئی فرق نہیں پڑتا اسی طرح میرے نبی بن کر آنے سے بھی حضور ﷺ کی ختم نبوت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تو یہ اس کا قیاس غلط ہوگا کہ کیوں کہ ''خاتم النبیین'' کے یہ معنی نہیں کہ پچھلے نبی زندہ بھی نہیں رہیں گے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ کے بعد کوئی نیا نبی نہیں آئے گا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے خالد کے لئے کہا جائے کہ یہ زید کا آخری لڑکا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ زید کے یہاں سب سے آخر میں یہ پیدا ہوا۔ اس کے بعد کوئی لڑکا پیدا نہیں ہوا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ پہلے جتنے لڑکے ہیں وہ سب فوت ہو گئے۔ بلکہ بعض دفعہ تو ایسا ہوتا ہے کہ یہ آخری لڑکا پہلے مر جاتا ہے اور پہلے والے بعد تک زندہ رہتے ہیں۔ بلا تشبیہ و بلا

تمثیل اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے محبوب ﷺ کو فرمایا کہ یہ میرے تمام نبیوں کے آخر میں آئے گا۔ یعنی اس کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اس سے پہلے جن کو نبوتیں ملی ہیں وہ اگر ان کے زمانہ میں زندہ رہیں یا آسمانوں پر سے تشریف لے آئیں تو حضور ﷺ کے "آخری نبی" ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہاں اگر کوئی نیا نبی آیا تو حضور ﷺ کو آخری نبی کہنا غلط ہو جائے گا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا قول کبھی غلط ہو نہیں سکتا۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ حضور ﷺ کے بعد کوئی نیا نبی قیامت تک آ ہی نہیں سکتا......!

آیت نمبر (6)

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝۳۱ (آل عمران)

"اے محبوب ﷺ آپ فرما دیجئے کہ اے لوگو اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری فرمانبرداری کرو اللہ تمہیں اپنا محبوب بنا لے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بہت بخشنے والا اور بے حد رحم فرمانے والا ہے"۔

فائدہ

اس آیت مبارکہ سے معلوم ہوا کہ گناہوں کی بخشش اور اللہ کا محبوب بننے کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی اتباع کی جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ حضور ﷺ تو ہمارے سامنے نہیں۔ اب ہم حضور ﷺ کی کیسے اتباع کریں......؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضور ﷺ کی احادیث ہمارے سامنے موجود ہیں۔ جن میں حضور ﷺ کے اقوال و اعمال اور افعال کا ذکر ہے تو گویا احادیث کی صورت میں حضور ﷺ کا پیکر جمال ہمارے سامنے موجود ہے۔ اب ہم ان کو دیکھ کر حضور ﷺ کی اتباع کر سکتے ہیں اور اللہ کے محبوب بن سکتے ہیں۔

بعض گروہ اور فرقے ایسے بھی پیدا ہو گئے ہیں جو احادیث کو نہیں مانتے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے لئے صرف قرآن کافی ہے۔ احادیث چونکہ ناقابل اعتماد ذرائع سے پہنچی ہیں۔ لہٰذا

ان پر عمل کرنا ہمارے لئے ضروری نہیں، لیکن مندرجہ بالا آیت مبارکہ سے اس نظریہ اور عقیدہ کا رد ہو رہا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مغفرت و نجات اور اپنی محبوبیت کو موقوف کر دیا ہے۔ حضور ﷺ کی اتباع پر اور ظاہر ہے کہ اب احادیث کے بغیر حضور ﷺ کی اتباع ممکن نہیں...... لہٰذا ماننا پڑے گا کہ احادیث کو ماننے بغیر اور ان پر عمل کئے بغیر نجات ممکن نہیں اور قرآن کے ساتھ ساتھ احادیث پر بھی عمل کرنا ضروری ہے۔ اگر صرف قرآن پر عمل کرنا کافی ہوتا تو اللہ تعالیٰ یہاں یہی فرماتا کہ میرے قرآن پر عمل کرلو۔ لیکن اس کے بجائے فرمایا کہ میرے محبوب کی اتباع کرو۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ قرآن کے ساتھ ساتھ میرے محبوب کی احادیث پر بھی عمل ضروری ہے۔

اور اگر قرآن کی دوسری آیات کو دیکھا جائے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ بغیر حدیث کے قرآن پر عمل کرنے کا دعویٰ کرنے والا جھوٹا ہے۔ وہ حدیث رسول کے بغیر قرآن پر بھی عمل نہیں کرسکتا۔ کیونکہ ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا...... وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیْھِمْ...... ہم نے آپ کی طرف ذکر یعنی قرآن نازل کیا، تا کہ آپ لوگوں سے بیان کریں جو احکام ان کی طرف نازل کئے گئے ہیں۔ دوسرے مقام پر حضور ﷺ کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا...... وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ...... کہ ہم نے اپنا محبوب اس لئے بھیجا ہے کہ وہ ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے۔ ان آیات سے معلوم ہوا کہ قرآن کی آیات اور مضامین کی تشریح وہ ہی اللہ کے یہاں مقبول ہے جو اس کے بھیجے ہوئے "معلم کتاب و حکمت" یعنی حضور اکرم ﷺ اس کی تشریح فرمائیں۔ کیونکہ آپ کو بھیجا ہی اس لئے گیا ہے کہ آپ اس کی تشریح کر کے لوگوں کو بتائیں۔ لہٰذا اب اگر کوئی اپنے ذہن سے قرآنی آیات کے نئے نئے معانی نکالے تو وہ اس کی تشریح قابل قبول نہیں ہوگی۔ بلکہ گمراہی اور ضلالت ہوگی۔ قرآن کی تشریح وہ ہی مقبول ہوگی جو حضور ﷺ نے فرمائی ہے اسی کا نام احادیث ہے۔ لہٰذا جو احادیث پر عمل کرے گا وہ ہی صحیح معنوں میں قرآن پر عمل کر رہا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ حدیث کے بغیر قرآن پر عمل ناممکن ہے۔ دیکھئے

قرآن نے تو صرف اتنا فرمایا کہ...... وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ......نماز قائم کرو لیکن نماز کسے کہتے ہیں......؟ اس کا کیا طریقہ ہے......؟ الغرض یہ کہ اذان سے لے کر رکوع و سجود اور سلام تک کے تمام افعال ہمیں احادیث سے پتہ چلے۔ اگر احادیث کو ہٹا دیں اور قرآن کے حکم...... وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ...... کے اپنے عقل سے معنی کریں تو لغت میں ''صلوٰۃ'' کے معنی ''تحریک الصلوین'' یعنی کولہے ہلانے کے آتے ہیں تو گویا عقلی لحاظ سے وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ کے معنی یہ ہوئے کہ کولہے ہلاؤ۔ یعنی خوب رقص و سرور کی محفلیں قائم کرو (معاذ اللہ) جب کہ یہ قطعاً قرآن کی منشاء نہیں بلکہ ایسا کرنا دین اسلام کے خلاف ہے تو پتہ یہ چلا کہ قرآن کے احکامات مجمل ہیں اور ان کی تفصیل حدیث میں ہے اور جو تفصیل حضور ﷺ نے بیان فرمائی ہے وہ ہی اللہ کی رضا ہے اور اسی پر عمل کر کے انسان اللہ کا محبوب بنے گا۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ حدیث کے بغیر قرآن پر عمل ہی ناممکن ہے۔

اور یہ بھی کہنا غلط ہے کہ حدیث ہمارے لئے حجت نہیں کہ وہ ناقابل اعتماد ذرائع سے پہنچی ہے۔ کیونکہ صحابہ کرام نے اہل بیت اطہار نے اور بڑے بڑے محدثین نے ہزاروں احادیث از بر یاد کر کے ان کو باقاعدہ لکھ کر ان پر خوب عمل کر کے جس طرح ان احادیث کی حفاظت کا اہتمام فرمایا اور بحفاظت حضور ﷺ کی احادیث ہم تک پہنچائی ہیں۔ ان کو دیکھتے ہوئے یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ احادیث غیر معتبر ہیں یا ان کے ذرائع غیر معتبر ہیں اور اگر بالفرض منکرین حدیث کی یہ بات درست ہو تو سوال یہ ہے کہ قرآن بھی تو ان ہی ذرائع سے ہم تک پہنچا ہے۔ اگر یہ ذرائع غیر معتبر ہیں تو پھر معاذ اللہ قرآن بھی غیر معتبر ٹھہرے گا۔ اس کا بھی انکار کر دو، اس کو کیوں مانتے ہو......؟ اور اگر اس کو مانتے ہو تو حدیث کو بھی مانو کہ دونوں چیزیں اسی ذریعہ سے ہم تک پہنچی ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں...... اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ...... فرما کے قرآن و حدیث دونوں کی اطاعت اور دونوں پر عمل کرنے کا ہمیں حکم دیا ہے اور...... یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰہِ اِلَیۡکُمۡ جَمِیۡعَا ۟ ......اے لوگوں میں تم سب لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں...... اس ارشاد نے یہ

بھی واضح کر دیا کہ آپ کی اطاعت صرف آپ کے زمانہ کے صحابہ پر ہی ضروری نہیں تھی بلکہ آپ ساری کائنات کے لئے رسول بن کر آئے ہیں۔ لہٰذا قیامت تک آنے والی مخلوق خدا کے لئے آپ کی اطاعت ضروری ہے اور آپ کے فرمان پر عمل ضروری ہے اور یہ احادیث جس طرح صحابہ کے لئے حجت تھیں۔ اسی طرح ہمارے لئے بھی حجت ہیں۔

☆☆

آیت نمبر (7)

وَسۡـَٔلۡ مَنۡ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رُّسُلِنَاۤ اَجَعَلۡنَا مِنۡ دُوۡنِ الرَّحۡمٰنِ اٰلِهَةً يُّعۡبَدُوۡنَ ﴿۴۵﴾ (الزخرف)

''اور جو رسول ہم نے آپ سے پہلے بھیجے ان سے پوچھئے کیا ہم نے رحمٰن کے سوا کچھ اور معبود بنائے جن کی عبادت کی جائے''۔

فوائد

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب حضور سرورِ کون و مکان ﷺ سے ارشاد فرمایا کہ اے محبوب آپ ان نبیوں سے پوچھئے جو آپ سے پہلے گزر گئے ہیں کہ کیا ہم نے رحمٰن کے سوا کچھ اور معبود بھی بنائے ہیں۔ جب کہ پوچھا اس سے جاتا ہے جو زندہ ہو سنتا ہو اور جواب دے سکتا ہو تو جو انبیاء اس عالم سے پردہ فرما گئے اور جب یہ آیت نازل ہوئی اس وقت نبی کریم کے زمانہ میں ان انبیاء کو وفات پائے ہوئے ہزاروں اور لاکھوں سال ہو گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ ان انبیاء سے پوچھنے کا اور سوال کرنے کا اپنے محبوب کو حکم دے رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء کو اللہ تعالیٰ وفات کے بعد نئی زندگی عطاء فرما دیتا ہے۔ وہ اپنی قبروں میں زندہ بھی ہوتے ہیں۔ سوال کرنے والوں کے سوالوں اور فریاد کرنے والوں کی فریادوں کو سنتے بھی ہیں اور اس کا جواب بھی دیتے ہیں۔ اگر انبیاء اپنی قبروں میں زندہ نہ ہوتے اور جیسا کہ بعض گستاخ لوگ کہتے ہیں کہ ''انبیاء مر کر مٹی میں مل گئے وہ کچھ نہیں سن سکتے'' اگر ان کا کہنا یہ درست ہوتا تو اللہ تعالیٰ کبھی بھی اپنے محبوب کو ان

85058

انبیاء سے مخاطب ہونے اور ان سے سوال کرنے کا حکم نہیں دیتا۔ کیونکہ بے جان اور بے عقل پتھروں سے مخاطب ہونا اور سوال کرنا کسی عقل مند کا کام نہیں۔

☆ اس آیت سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ انبیاء اپنی قبروں میں مقید نہیں بلکہ وہ جب چاہتے ہیں تو عالم کی سیر بھی فرماتے رہتے ہیں اور اللہ کے مقبول بندوں سے کلام بھی فرماتے ہیں۔ کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب سے یہ نہیں فرمایا کہ کسی خط کے ذریعہ یا کسی تار یا ٹیلی فون کے ذریعہ ان سے پوچھئے یا ان کی قبر پر جا کر ان سے پوچھئے۔ نہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی تمام انبیاء کے مزارات پر گئے۔ لہٰذا اس آیت کے معنی یہ بنیں گے کہ اے محبوب وہ انبیاء آپ کے پاس آتے جاتے رہتے ہیں۔ آپ کا ان سے ملنا جلنا رہتا ہے کبھی معراج کی رات ان سے مسجد اقصیٰ میں ملاقات ہو رہی ہے تو کبھی آسمانوں پر ان سے ملاقات ہو رہی ہے۔ لہٰذا جب بھی ان سے ملاقات ہو تو آپ ان سے پوچھ لیں۔ معلوم ہوا کہ انبیاء عالم کی سیر بھی فرماتے رہتے ہیں۔ بعض لوگ جو نبیوں کی حیات اور زندگی کو نہیں مانتے وہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر نبی مرنے کے بعد بھی زندہ ہیں تو پھر ان کو غسل کیوں دیا گیا۔ دفن کیوں کیا گیا اور پھر اللہ نے ان کے لئے یہ کیوں فرمایا...... اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ...... بے شک آپ پر موت آنی ہے اور یقیناً انہیں بھی مرنا ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ روح کے جسم سے نکل جانے کا نام موت ہے اور یہ ایک دفعہ انبیاء اور اولیاء اور عام انسانوں سب کو آئے گی۔ یعنی جب کسی کا وقت آجاتا ہے تو اس کی روح اس کے جسم سے نکل جاتی ہے۔ اسی کو قرآن نے ''اِنَّكَ مَيِّتٌ'' اور ''كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ'' (جو بھی زمین پر ہے سب کو فنا ہے) اور كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے سے تعبیر فرمایا۔ اور اسی کے باعث کفن دفن وغیرہ کے احکامات ان پر لاگو ہوتے ہیں۔ لیکن ہماری اور انبیاء کی موت میں فرق یہ ہے کہ ہماری روح جسم سے نکل کر جسم کو چھوڑ دیتی ہے اس کی حفاظت نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے جسم گل سڑ جاتے ہیں۔ لیکن انبیاء واولیاء کی روحیں اپنے جسموں کو چھوڑتی نہیں بلکہ اپنے جسموں سے ان کا تعلق مزید قوی ہو

جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جسم گلتے نہیں۔ خراب نہیں ہوتے۔ قیامت تک قبروں میں تروتازہ رہتے ہیں۔ اور ان کی سننے دیکھنے وغیرہ کی طاقتیں پہلی زندگی سے کہیں زیادہ ہو جاتی ہیں۔ اسی لحاظ سے ان کو زندہ کہا جاتا ہے۔

☆☆

آیت نمبر (8)

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللهِ أَمْوَاتٌ ۭ بَلْ أَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُونَ ﴿۱۵۴﴾ (البقرہ)

"اور جو خدا کی راہ میں مارے جائیں انہیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں شعور نہیں"۔

فائدہ

اس آیت سے معلوم ہوا کہ شہید مرنے کے بعد بھی زندہ ہوتے ہیں۔ ان کو مردہ نہیں کہنا چاہئے بلکہ دوسرے مقام میں تو اللہ تعالیٰ نے منع فرمادیا کہ شہیدوں کے مردہ ہونے کا گمان بھی نہ کرو۔ ان کے مردہ ہونے کا خیال بھی نہ لاؤ تو یہاں سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ وہ شہید جو اللہ اور اس کے رسول کے نام پر جان دیتا ہے جب اس کا یہ مقام ہے کہ اس کو مردہ کہنے اور مردہ گمان کرنے سے بھی اللہ تعالیٰ منع فرما رہا ہے اور اس کی ابدی حیات اور زندگی کا اعلان فرما رہا ہے تو پھر جس کے نام پر جان دی ہے وہ نبی کیوں نہ زندہ ہوگا......؟ جب نبی کے ایک شہید امتی کی یہ شان ہے تو نبی تو اپنے امتی سے کہیں بلند و بالا مرتبہ کا مالک ہوتا ہے۔ پھر ان کے زندہ ہونے میں کیسے شک کیا جاسکتا ہے۔

معلوم ہوا کہ تمام انبیاء اپنے اپنے مزارات میں زندہ ہیں اور حی ہیں۔ علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے بخاری کی شرح فتح الباری میں حیات انبیاء پر یہی استدلال فرمایا ہے۔ جب کہ ہمارے نبی ﷺ کا زندہ ہونا ایک تو اسی طرح سے ثابت ہے کہ آپ کا شہید سے کہیں بلند و بالا مرتبہ ہے۔ جب قرآن کی اس آیت کی رو سے شہید زندہ ہیں تو ان کے

آقا و مولیٰ حضور سرور کائنات ﷺ بدرجہ اولیٰ زندہ ہیں اور حی ہیں اور دوسرے طریقہ سے آپ کا حی اور زندہ ہونا اس طرح بھی ثابت ہے کہ آپ خود شہید ہیں۔ کیونکہ مرض وفات میں حضور ﷺ نے خود فرمایا تھا کہ مجھے خیبر میں جو زہر آلود گوشت دیا گیا تھا جس کا میں نے ایک لقمہ کھایا تھا اس کی تکلیف مجھے ہمیشہ محسوس ہوتی رہی اور اسی کی وجہ سے آج میری رگ جان منقطع ہو رہی ہے۔

(انباء الاذکیا فی حیاۃ الانبیاء، لسیوطی ص 149 بحوالہ امام بخاری و امام بیہقی)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ کی وفات اس زہر کی وجہ سے ہوئی لہٰذا یہ آیت مبارکہ آپ پر بھی صادق آتی ہے کہ آپ اللہ کی راہ میں مارے گئے۔ اس لئے آپ شہید ہیں زندہ ہیں۔ قرآن کے ارشاد کے مطابق آپ کو مردہ کہنا تو دور کی بات رہی مردہ گمان کرنا بھی جائز نہیں۔ اب اگر کوئی نبی کو یہ کہتا ہے کہ نبی مر گئے اور اب زندہ نہیں ہیں تو وہ قرآن کے خلاف کرتا ہے۔ قرآن نے جس چیز سے منع کیا ہے وہ ہی بات کہہ کر وہ خدا کے غضب اور عذاب کو دعوت دے رہا ہے۔ تعجب ہے ایسے لوگوں پر جو شہید کی زندگی تو مان لیتے ہیں لیکن نبی کی حیات اور زندگی کو نہیں مانتے۔ حالانکہ نبی کریم ﷺ کی زندگی تو شہید کی زندگی سے کہیں زیادہ ہے۔ دیکھئے شہیدوں کے وصال کے بعد ان کی جائیدادیں تقسیم ہوتی ہیں۔ ان کی بیواؤں سے نکاح کیا جا سکتا ہے۔ لیکن حضور ﷺ کا مال نہ وراثت میں تقسیم ہو سکتا تھا اور نہ آپ کی ازواج مطہرات کے ساتھ کسی مسلمان کو نکاح کرنا جائز تھا۔ اس لئے کہ آپ زندہ تھے اور کسی زندہ کی بیوی سے کوئی دوسرا نکاح نہیں کر سکتا۔ معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کی حیات اور زندگی شہید کی حیات سے بھی کہیں زیادہ بڑھ کر ثابت ہے۔ اسی لئے معراج کی رات حضور ﷺ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ اپنی قبر میں نماز پڑھ رہے تھے۔ (بیہقی) حضور ﷺ نے فرمایا کہ انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں۔ (ابو یعلیٰ بیہقی فی کتاب حیاۃ النبی) اسی لئے حضرت سعید بن مسیب فرماتے ہیں کہ جنگ حرہ میں جب نماز کا وقت ہوتا تھا تو میں مسجد نبوی میں اکیلا ہوتا تھا اور حضور ﷺ کی

قبر انور سے اذان اور تکبیر کی آواز سنتا تھا (دارمی، ابونعیم، اخبار مدینہ، طبقات ابن سعد) ثابت ہوا کہ انبیاء کرام بالخصوص ہمارے آقا و مولا ﷺ زندہ ہیں اور حی ہیں۔

☆☆

آیت نمبر (9)

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ﴿١٥﴾ (المائدہ)

"بیشک تمہارے پاس جلوہ گر ہو گیا اللہ کی طرف سے نور اور روشن کتاب"۔

فائدہ

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے تمام متقدمین اور متاخرین مفسرین حتیٰ کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما جیسے عظیم مفسر صحابی فرماتے ہیں کہ یہاں اس آیت میں نور سے حضور ﷺ کی ذات گرامی اور کتاب سے قرآن پاک مراد ہے۔ بلکہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ شرح شفاء میں فرماتے ہیں کہ یہاں نور اور کتاب دونوں سے حضور ﷺ کی ذات گرامی مراد ہے اور ان دونوں لفظوں کے درمیان "واؤ" یہ عطف تفسیری ہے۔ علامہ اقبال رحمہ اللہ نے اپنے ایک شعر میں اسی مضمون کو یوں بیان فرمایا۔

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

بہرحال اس آیت سے ثابت ہو گیا کہ حضور اکرم ﷺ اللہ تعالیٰ کے نور ہیں۔ خود حضور ﷺ نے فرمایا کہ اے جابر اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے تیرے نبی کے نور کو اپنے نور سے پیدا فرمایا (مواہب اللدنیہ ج 1 ص 9/ زرقانی ج 1 ص 42/ سیرت حلبیہ ج 1/ ص 37/ حجۃ اللہ علی العالمین ص 28) تو ثابت ہوا کہ کائنات کی تخلیق سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے جس نور کو پیدا فرمایا تھا وہ نور بارہ ربیع الاول کو پیکر بشریت اور لباس آدمیت کے اندر آمنہ بی بی کی گود میں جلوہ گر ہو گیا۔

لہٰذا جن آیات اور احادیث میں آیا ہے کہ آپ بشر ہیں وہ بھی درست ہیں اور جن میں

آیا ہے کہ آپ نور ہیں وہ بھی درست ہیں۔ ہمارا دونوں پر ایمان ہے۔ ہم آپ کو نور بھی مانتے ہیں اور بشر بھی مانتے ہیں۔ لیکن آپ کی بشریت عام آدمی کی طرح نہیں تھی بلکہ اس نور کی وجہ سے آپ کی بشریت بھی مصفی ومجلی اور نورانی ہوگئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سورج اور چاند کی روشنی میں آپ کے جسم کا سایہ نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ آپ نور تھے اور نور کا سایہ نہیں ہوتا۔ اس بات کا اقرار مولوی رشید احمد گنگوہی نے اپنی کتاب امداد السلوک میں صفحہ 86/85 پر بھی کیا۔ بلکہ انہوں نے لکھا ہے کہ آپ خود بھی نور تھے اور دوسروں کو بھی نور دیتے تھے۔ کیونکہ قرآن میں آپ کو ''سراجا منیرا'' فرمایا گیا۔ جس کے معنی روشن کرنے والے سورج کے ہیں۔ یعنی نور دینے والا۔ معلوم ہوا کہ آپ خود بھی نور تھے اور دوسروں کو بھی نور دیتے تھے اور ان کو بھی نورانی بنادیا کرتے تھے۔

چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضرت طفیل بن عمر دوسی رضی اللہ عنہ کو جب آپ ﷺ نے تبلیغ اسلام کے لئے بھیجنے کا ارادہ فرمایا تو انہوں نے عرض کیا کہ مجھے کوئی ایسی خاص نشانی عطاء فرمادیجئے جس سے لوگوں کو یقین ہو جائے کہ میں آپ کا بھیجا ہوا ہوں اور وہ میری بات کو تسلیم کریں تو آپ ﷺ نے اپنی انگلی مبارک ان کے ماتھے پر رکھ دی جس سے ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان کا حصہ نورانی ہوگیا اور چمکنے لگا۔ انہوں نے عرض کیا کہ کہیں لوگ اس کو برص کا داغ نہ خیال کرلیں اس نور کو کسی دوسری جگہ منتقل فرما دیجئے۔ آپ ﷺ نے ان کی چھڑی کو اس روشن جگہ پر لگایا تو وہ روشنی اور نور اس چھڑی میں آگیا اور وہ چھڑی چمکنے لگی۔ (مدارج النبوۃ، شیخ عبدالحق) اس سے ثابت ہوا کہ آپ ایسے نور ہیں کہ دوسروں کو بھی چمکا دیتے ہیں۔

چمک تجھ سے پاتے ہیں سب پانے والے
میرا دل بھی چمکا دے چمکانے والے

بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن میں حضور ﷺ کو کہیں بشر کہا گیا ہے تو کہیں عبد (بندہ) کہا گیا ہے جو بشر اور عبد ہوتا ہے وہ نور نہیں ہوتا۔ لہٰذا آپ بشر ہیں نور نہیں۔ اس

کا جواب یہ ہے کہ حضرت جبرئیل امین جب حضرت مریم علیہا السلام کے پاس آئے تو وہ انسانی اور بشری صورت میں آئے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے...... فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا...... تو ان کے سامنے وہ ایک تندرست آدمی کے روپ میں ظاہر ہوئے۔ یہاں اس آیت میں جبرئیل امین کو بشر کہا گیا۔ قرآن کی دوسری آیت مبارکہ ہے...... بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ...... یہاں تمام فرشتوں کو ''عبد'' اور اللہ کے بندے کہا گیا ہے۔ تو معلوم یہ ہوا کہ عبدیت وبشریت، نورانیت کے منافی نہیں۔ جبرئیل اور دیگر فرشتے جو نور سے بنے ہیں وہ ''عبد اور بشر'' کہلانے کے باوجود نورانی رہ سکتے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ''عبد اور بشر'' ہونے کے باوجود نورانی ہو سکتے ہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے نور کو سب سے پہلے پیدا کیا اس لئے آپ کو نور کہا اور اس نور کو انسانی اور بشری لباس میں دنیا کے اندر مبعوث فرمایا۔ اس لئے آپ کو قرآن نے بشر بھی فرمایا۔ لہٰذا آپ نور بھی ہیں اور بشر بھی ہیں۔ دونوں میں کوئی تعارض اور منافات نہیں۔

☆ اس آیت مبارکہ میں کتاب یعنی قرآن کے ساتھ نور کا ذکر کر کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ کتاب بغیر نور اور روشنی کے نہیں پڑھی جا سکتی۔ اسی طرح یہ کتاب بھی یعنی قرآن حکیم بھی بغیر نور اور روشنی کے نہیں پڑھا جا سکتا۔ اس کے لئے ایک خاص نور کی ضرورت ہے اور وہ ہے ''نور مصطفیٰ'' لہٰذا جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال یعنی احادیث رسول کی روشنی میں قرآن کو نہیں پڑھو گے قرآن ہرگز تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ ہم نے کتاب کے ساتھ نور اسی لئے بھیجا ہے کہ اس کتاب کو نور مصطفیٰ یعنی احادیث رسول کی روشنی میں پڑھنا۔ لہٰذا اس آیت میں ان لوگوں کا بھی رد ہو گیا جو کہتے ہیں کہ قرآن کافی ہے حدیث کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ قرآن اس نور مصطفیٰ یعنی احادیث کی روشنی کے بغیر تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

☆☆☆

آیت نمبر (10)

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ (الاحزاب:32)

اے نبی کی (پاک) بیویو تم عورتوں میں سے کسی کی مثل نہیں۔

فائدہ

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی ازواج مطہرات کو فرمایا کہ تم کسی عورت کی مثل اور برابر نہیں۔ تم سارے جہاں کی عورتوں سے افضل واعلیٰ اور نرالی ہو اور کوئی عورت تمہاری ہمسری اور برابری نہیں کر سکتی۔ ازواج مطہرات کو یہ بے مثل ہونے کا مقام حضور سرور کائنات ﷺ کی نسبت اور تعلق کی وجہ سے حاصل ہوا تو جب آپ کے تعلق سے آپ کی ازواج مطہرات تمام عورتوں میں بے مثل ہو گئیں تو خود حضور ﷺ ساری کائنات میں کیوں نہ بے مثل و بے مثال ہوں گے......؟ ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو بے مثال بنا کر پیدا فرمایا۔ حضور ﷺ جیسا نہ ہوا اور نہ قیامت تک کوئی ہو سکتا ہے۔

اس کی تائید اس حدیث مبارک سے بھی ہوتی ہے کہ جب صحابہ کرام نے حضور ﷺ کو دیکھ کر آپ کی طرح بغیر کچھ کھائے پیئے صرف کھجور پر افطار کر کے لگا تار روزے رکھنے شروع کیے تو ان کو ضعف لاحق ہو گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا بات ہے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ آپ صوم وصال رکھتے ہیں اسی طرح ہم نے بھی رکھنا شروع کر دیا۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا...... ايكم مثلي اني ابيت يطعمني ربي ويسقيني...... تم میں سے کون میرے مثل ہے۔ میں اس حال میں رات گزارتا ہوں کہ میرا رب مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔ (بخاری جلد 1 صفحہ 246/ مسلم جلد 1/ صفحہ 351/ ابوداؤد جلد 1/ صفحہ 235)

ایک روایت میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں...... اِنِّیْ لَسْتُ مِثْلَکُمْ اِنِّیْ اُطْعِمُ وَاُسْقٰی ...... کہ میں تمہارے مثل نہیں مجھے کھلایا اور پلایا جاتا ہے۔ (بخاری جلد 1/ صفحہ 246/ مسلم جلد 1/ ص 325) حضور ﷺ نے صحابہ کرام کے سامنے یہ الفاظ فرمائے لیکن کسی صحابی

نے اس کے جواب میں یہ نہیں عرض کیا کہ آپ تو ہماری طرح کے بشر ہیں۔ آپ کے بھی دو ہاتھ ہمارے بھی دو ہاتھ، آپ کی بھی دو آنکھیں ہماری بھی دو آنکھیں، بلکہ سب خاموش ہو گئے۔ ثابت ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد پر سب صحابہ کا ایمان اور یقین تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے مثل و بے مثال ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی چیز بھی ہم جیسی نہیں۔ آپ کے ہاتھ، پیر، آنکھ، ناک، کان الغرض سر سے لے کر پاؤں تک ایک ایک عضو ایک ایک بال آپ کا بے مثل و بے مثال ہے۔ دیکھو ہماری آنکھیں صرف آگے دیکھتی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھیں پیچھے حتیٰ کہ دل کی کیفیت خشوع و خضوع کو بھی دیکھ لیا کرتی تھیں (موطا امام مالک) ہمارے کان کے برابر سے کوئی آہستہ سے گزر جائے تو اس کے چلنے کی آواز نہیں سن سکتے۔ جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ساتوں آسمانوں سے اوپر معراج کی رات جنت میں تھے اور بلال زمین پر چل رہے تھے تو وہاں جنت میں بلال کے زمین پر چلنے کی آواز سن رہے تھے۔ (بخاری و مسلم) ہمارے پسینہ میں بدبو آتی ہے۔ جب کہ نبی کے پسینہ میں مشک و عنبر سے بھی زیادہ خوشبو تھی۔ ہمارا خون حرام ہے۔ اس کو اگر کوئی چکھ بھی لے تو سخت گناہ گار ہوگا اور جہنم کی سزا کا مستحق ہوگا۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خون مبارک کو حضرت مالک بن سنان نے پی لیا تو آپ نے فرمایا اب تجھے دوزخ کی آگ ہرگز نہیں چھوئے گی۔ (شفاء، قاضی عیاض ص 64) اسی لئے حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

وَاَحْسَنُ مِنْکَ لَمْ تَرَقَطُّ عَیْنِیْ وَاَجْمَلُ مِنْکَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ

کہ آپ ایسے بے مثل و بے مثال ہیں کہ آپ جیسا حسین نہ میری آنکھ نے دیکھا اور نہ آپ جیسا جمیل کسی ماں نے جنا۔ آپ کی ہر چیز بے مثال ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان احادیث سے تو یہ ثابت ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی کی مثل نہیں بلکہ بے مثل و بے مثال ہیں۔ جب کہ قرآن میں آتا ہے قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ کہہ دیجئے کہ میں تمہاری مثل بشر ہوں (کہف:110) تو بظاہر یہ آیت ان احادیث کے خلاف معلوم ہوتی ہے......؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آیت احادیث کے خلاف نہیں کیوں کہ جس آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ

میں تمہاری مثل ہوں۔اس سے مراد یہ ہے کہ معبود اور خدا نہ ہونے میں تمہاری مثل ہوں۔ جس طرح تم معبود نہیں اسی طرح میں بھی معبود نہیں۔لیکن جس حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہاری مثل نہیں۔اس سے مراد یہ ہے کہ اس کے علاوہ اور کسی بھی چیز میں کوئی حضور ﷺ کے مثل نہیں۔حضور ﷺ ہر چیز میں بے مثال و بے نظیر ہیں۔لہٰذا آیت اور احادیث دونوں اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔

☆☆

آیت نمبر (11)

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا

"پس اس قوم کے سردار جو کافر تھے انہوں نے کہا ہم تو تمہیں اپنے جیسا بشر دیکھتے ہیں"۔(ہود:27)

فائدہ

اس آیت مبارکہ میں کافروں کا قول نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے اپنے نبی سے کہا کہ تم تو ہم جیسے بشر ہو۔معلوم ہوا کہ نبیوں کو اپنے جیسا بشر کہنا یہ کافروں کا طریقہ اور ان کا دستور ہے اور بطور توہین نبیوں کو اپنے جیسا بشر کہنے سے آدمی کافر ہو جاتا ہے۔بلکہ دوسری آیت میں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ پچھلے زمانہ میں کافروں پر ہم نے دردناک عذاب اسی لئے نازل کیا کہ وہ اپنے نبیوں کو بشر کہا کرتے تھے۔چنانچہ ارشاد رب العزت ہے اَلَمْ یَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ؗ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِیْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَقَالُوْۤا اَبَشَرٌ یَّهْدُوْنَنَا ؗ فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ۝ "اے حبیب کیا آپ کے پاس ان لوگوں کی خبر نہیں آئی جنہوں نے آپ سے پہلے کفر کیا تو انہوں نے (دنیا میں) اپنے کام کا وبال چکھ لیا اور (آخرت میں) ان کے لئے دردناک عذاب ہے، یہ اس لئے کہ ان کے رسول ان کے پاس روشن دلیلیں لے کر آتے تھے تو انہوں نے کہا کیا بشر ہمیں ہدایت کرے گا تو وہ کافر ہو گئے اور انہوں نے

روگردانی کی اور اللہ نے ان کی کچھ پرواہ نہ کی اور اللہ بے نیاز اور حمد کیا ہوا ہے"۔ (سورہ تغابن) اس آیت سے معلوم ہوا کہ پچھلی امتوں پر عذاب اس لئے نازل ہوا کہ انہوں نے اپنے نبیوں کو اپنے جیسا بشر کہا تھا جس کی وجہ سے وہ کافر ہو گئے اور اللہ نے عذاب بھیج کر ان کو تباہ و برباد کر دیا۔ ثابت ہوا کہ انبیاء کو اپنے جیسا بشر کہنا یہ کفر تک لے جاتا ہے اور اللہ کے غضب و عذاب کا موجب بنتا ہے۔ لہٰذا نبیوں کو اپنے جیسا بشر کہہ کر اپنا دین و ایمان اور آخرت برباد نہیں کرنا چاہیے۔

بعض لوگ اس زمانہ میں حضور اکرم ﷺ کو معاذ اللہ اپنے جیسا بشر کہتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ قرآن میں اللہ نے فرمایا ہے قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اے حبیب ﷺ آپ فرما دیجئے کہ میں تم جیسا بشر ہوں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قُلْ فرما کر اپنے محبوب کو فرمایا ہے کہ آپ کہیں، یہ نہیں فرمایا ہے کہ تم بشر ہو، ہمیں کہنے کا حکم نہیں۔ لہٰذا نبی بطور تواضع اپنے آپ کو کہہ سکتے ہیں لیکن ہمیں حق نہیں پہنچتا کہ ہم ان کو اپنے جیسا بشر کہیں۔ اگر کہہ کے ان سے ہمسری اور برابری کا دعویٰ کریں گے تو کافر ہو جائیں گے۔

قرآن سے ثابت ہے کہ جس نے سب سے پہلے کسی نبی کو بشر کہا وہ شیطان تھا اور اس کے بعد جنہوں نے بھی نبی کو اپنے جیسا بشر کہا وہ کافر تھے۔ کسی مسلمان کا قول قرآن میں ذکر نہیں۔ ہاں البتہ نبیوں کا رب یا خود نبی اپنے آپ کو بطور تواضع کے کہہ سکتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن میں کئی مقامات پر انبیاء نے اپنے آپ کو بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کہا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم بھی ان کو کہنا شروع کر دیں۔ ہم کہیں گے تو بے ادبی اور گستاخی کہلائے گی۔ جیسے قرآن میں آتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے لئے...... ربنا ظلمنا انفسنا...... کہا اور حضرت یونس علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ لیکن ہم یہ الفاظ اپنی طرف سے ان نبیوں کے لئے نہیں کہہ سکتے۔ اگر کسی نے معاذ اللہ حضرت یونس علیہ السلام کو ظالم کہہ دیا تو وہ کافر ہو جائے گا۔ اسی طرح حضور ﷺ نے اپنے آپ کو اپنے امتیوں کا بھائی فرمایا۔ بطور تواضع آپ کا فرمانا درست ہے لیکن ہمیں ایسے

عام الفاظ حضور ﷺ کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں۔ قرآن نے...... لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ...... فرما کے حضور ﷺ کو بشر یا بھائی وغیرہ کے عام نام سے پکارنے سے منع فرما دیا۔

☆☆

آیت نمبر (12)

عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰى غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ

اللہ تعالیٰ غیب جاننے والا ہے اور وہ آگاہ نہیں کرتا اپنے غیب پر کسی کو مگر جنہیں اس نے پسند فرمالیا جو اس کے رسول ہیں۔ (جن: 27)

فائدہ

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ''علم غیب'' اللہ تعالیٰ ہر کسی کو عطا نہیں فرماتا بلکہ اپنے رسولوں کو عطا فرماتا ہے جو اس کے چنے ہوئے پسندیدہ اور برگزیدہ بندے ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس آیت سے ثابت ہو گیا کہ ''علم غیب'' نبیوں کو بھی حاصل ہوتا ہے اور ہمارے نبی تو تمام نبیوں کے سردار ہیں۔ ان کو تو اللہ تعالیٰ نے اتنا علم غیب عطا فرمایا کہ کائنات کی ابتداء سے لے کر قیامت تک جو کچھ ہونے والا ہے ہر چیز کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو عطا فرما دیا اور اس کو قرآن کی اس آیت میں بیان فرمایا وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكَ عَظِیْمًا ﴿۱۱۳﴾ ''اور آپ کو سکھا دیا جو کچھ آپ نہیں جانتے تھے اور آپ پر اللہ کا بڑا فضل ہے''۔ (نساء)

اس آیت میں مَا کا لفظ عام ہے یعنی جو کچھ نہیں جانتے سب چیزوں کا علم عطا فرما دیا۔ اس میں تمام قسم کے علم غیب آ گئے۔ جس علم کو دینے کے بعد اللہ تعالیٰ اس کو اپنا فضل عظیم فرمائے اس علم غیب کی عظمت اور وسعت کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ اس علم کی وسعت کا مشاہدہ صحابہ کرام نے فرمایا۔ چنانچہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ایک دن صبح سے غروب آفتاب تک خطاب فرمایا۔ پس آپ نے قیام

قیامت تک ہونے والی ہر شئی کی خبر دے دی۔ (مسلم شریف / مشکوٰۃ)

ثابت ہوا کہ غیب کی تمام باتیں حضور ﷺ کے علم میں تھیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ غیب کا علم صرف نبیوں کو اور ہمارے نبی حضور سرور کونین ﷺ کو ہے یا حضور ﷺ کی امت کے اولیاء کو بھی ہے......؟ تو آیئے قرآن سے پوچھیں......! قرآن کہتا ہے وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ ﴿۲۴﴾ "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہمارا نبی علم غیب بتانے میں بخیل نہیں" (تکویر) یعنی جس طرح بخیل پیسے بچا بچا کے رکھتا ہے اور کسی کو اس میں سے کچھ نہیں دیتا اس طرح ہمارا نبی علم غیب کے معاملہ میں بخیل نہیں کہ وہ کسی کو کچھ نہیں بتائے۔ بلکہ وہ اپنے پیاروں کو غیب کا علم عطا فرما دیتا ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ حضور ﷺ کو علم غیب عطا فرماتا ہے اور پھر حضور ﷺ اس کو اپنے صحابہ کرام اور اولیاء میں تقسیم فرما دیتے ہیں۔ لہٰذا اولیاء کو جو علم غیب حاصل ہوتا ہے وہ حضور ﷺ کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ پھر ان کی یہ شان ہوتی ہے کہ حضرت غوث پاک" فرماتے ہیں۔

نَظَرْتُ اِلٰى بِلَادِ اللّٰهِ جَمْعاً كَخَرْدَلَةٍ عَلٰى حُكْمِ اتِّصَالِىْ

کہ میں نے اللہ تعالیٰ کے سارے شہروں کو اس طرح دیکھ لیا جیسے چند رائی کے دانے ملے ہوئے ہوں۔ حضرت بہاؤ الدین نقشبند" فرماتے ہیں کہ ہماری نظر تمام روئے زمین پر اس طرح ہے جیسے اپنے ناخنوں کو دیکھ رہے ہوں کوئی چیز ہماری نظروں سے اوجھل نہیں۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ نبیوں اور ولیوں کو غیب کا علم نہیں ہوتا اور وہ دلیل کے طور پر وہ آیات لاتے ہیں جن میں آتا ہے کہ غیب صرف اللہ ہی جانتا ہے اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ کسی آیت میں آتا ہے کہ اے حبیب آپ کہہ دیجئے کہ میں علم غیب نہیں جانتا، حضور نے فرمایا کہ مجھے پتہ نہیں کیا ہوگا۔ اس قسم کی آیات اور احادیث کا مطلب یہ ہے کہ ذاتی طور پر صرف اللہ تعالیٰ ہی غیب جانتا ہے اور اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور ذاتی طور پر یعنی خود بخود کوئی نبی اور کوئی ولی غیب نہیں جانتا بلکہ جو بھی غیب کا علم رکھتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عطا سے اور اللہ تعالیٰ کے بتلانے سے علم رکھتا ہے۔ لہٰذا جہاں بھی علم غیب کی نفی ہے اس سے

ذاتی علم غیب کی نفی مراد ہے اور جہاں قرآن کی آیات میں ثابت کیا گیا ہے کہ نبیوں ولیوں کو علم غیب حاصل ہے اس سے علم غیب عطائی مراد ہے۔ اگر یہ جواب نہ دیا جائے تو پھر تو قرآن کی آیات میں تعارض ہو جائے گا۔ حالانکہ قرآن میں تعارض نہیں۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ دونوں آیات درست ہیں۔ جہاں علم غیب کی نفی ہے اس سے ذاتی مراد ہے اور جہاں پر علم غیب کا ثبوت ہے اس سے عطائی مراد ہے۔

☆☆

آیت نمبر (13)

وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰۷﴾ (الانبیاء)

"اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر سراپا رحمت بنا کر سارے جہانوں کے لئے"۔

فائدہ

اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضور اکرم ﷺ آج بھی سارے جہانوں کے لئے رحم و کرم فرمانے والے ہیں اور ظاہر ہے کوئی رحم و کرم اسی وقت کرے گا جب وہ زندہ بھی ہو اور جس پر رحم و کرم کرے اس کے حال سے واقف بھی ہو۔ اس کے قریب بھی ہو اور اس کی مدد کرنے کی قدرت اور طاقت بھی رکھتا ہو۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ میرا محبوب سارے جہانوں پر لگاتار رحمت فرمانے والا ہے کہ سراپا رحمت بن کر آیا ہے۔ تو اس سے پتہ چلا کہ حضور زندہ بھی ہیں۔ تمام جہان والوں سے قریب بھی ہیں۔ ان کے حالات سے واقف اور باخبر بھی ہیں اور ان کی مدد کرنے پر قدرت بھی رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی طاقت سے ان کی دستگیری اور مشکل کشائی بھی فرما سکتے ہیں۔ کیوں کہ یہ چیزیں اور اوصاف اگر حضور ﷺ میں نہ ہوں تو حضور ﷺ کا رحمت للعالمین ہونا ثابت نہیں ہو سکے گا۔ جبکہ قرآن آپ ﷺ کو رحمت للعالمین فرما رہا ہے۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ یہ تمام صفات حضور ﷺ میں موجود ہیں۔ اسی کو آج کل کے عرف عام میں "حاضر و ناظر" کہتے ہیں۔

بعض لوگ حاضر کا مفہوم غلط سمجھتے ہیں کہ آپ جسمانی طور پر ہر جگہ موجود ہیں۔ یہ معنی

حاضر کے ہرگز نہیں بلکہ حاضر وناظر کے معنی یہ ہیں کہ آپ اپنے روضہ شریف میں جلوہ فرما ہو کر پچھلی امتوں اور اپنی امت کے بلکہ ساری کائنات کے قیامت تک آنے والے حالات سے باخبر بھی ہیں اوران کو دیکھ بھی رہے ہیں اور اپنی روحانیت وعلمیت اور دستگیری کے لحاظ سے ان سے قریب بھی ہیں اوران پر رحم وکرم فرمانے اوران کی مدد کرنے پر قدرت بھی رکھتے ہیں۔حاضر وناظر کے اسی مفہوم کو اس آیت مبارکہ کے علاوہ رب کائنات نے قرآن پاک میں دوسرے مقام پر اس طرح بیان فرمایا...... اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًاۙ وَّ دَاعِیًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا ...... "اے حبیب ہم نے آپ کو بھیجا شاہد بنا کر خوش خبری سنانے والا اور ڈر سنانے والا اور اللہ کے اذن سے اللہ کی طرف بلانے والا اور روشن کرنے والا سورج بنا کر۔اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو شاہد فرمایا جس کے معنی متقدمین ومتاخرین اپنے اور بیگانے سب مفسرین نے "گواہ" کے لکھے ہیں۔جب کہ گواہ وہ ہوتا ہے جو کسی چیز کو آنکھوں سے دیکھ کر گواہی دے۔گواہی کے اندر آنکھوں سے دیکھنا ضروری ہوتا ہے۔(فتاویٰ شامی ج 2 ص 411/افاضات یومیہ، از اشرف علی تھانوی ج 2/ص 281/البحرالرائق ج 7/ص 55) اب سوال یہ ہے کہ حضور ﷺ کو قرآن نے گواہ کیوں کہا......؟ آپ کس چیز کی گواہی دیں گے......؟ تو قرآن میں ہی دوسرے مقام پر اس کی وضاحت کر دی گئی کہ آپ اپنی امت اور پچھلے نبیوں اوران کی امتوں کے اعمال کی گواہی دیں گے۔(بقرہ:143/نساء:41) تو ثابت ہو گیا کہ اولین وآخرین کے تمام اعمال پر اوران کے تمام احوال پر آپ کی نگاہ ہے اور آپ اس سے باخبر ہیں جب ہی تو آپ گواہی دیں گے۔اگر باخبر نہ ہو تو آپ ان کے گواہ کیسے بنیں گے۔جب کہ قرآن آپ کو ان سب کا گواہ بتا رہا ہے۔لہٰذا ثابت ہو گیا کہ آپ حاضر وناظر ہیں......!

اور اسی حاضر وناظر کی مزید تشریح اسی آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو "سِرَاجًا مُّنِیْرًا" یعنی چمکانے والا آفتاب کہہ کے فرمادی کہ جس طرح سورج آسمان پر ہوتا

ہے لیکن اس کی روشنی سارے جہاں میں موجود ہوتی ہے۔اسی طرح میرا محبوب بھی آسمان نبوت کا وہ سورج ہے جو جسمانی لحاظ سے اپنے روضہ شریف میں جلوہ فرما ہے، لیکن اپنی روحانیت وعلیت اور دستگیری کے لحاظ سے وہ ہر جگہ جلوہ گر ہے۔اسی کو سرکار دو جہان ﷺ نے اپنی ایک حدیث میں بیان فرمایا۔آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ میں تمہارا پیش خیمہ ہوں اور میں تمہارا گواہ ہوں اور مجھے اللہ کی قسم ہے بے شک میں ابھی اپنے حوض کو دیکھ رہا ہوں۔

(بخاری شریف جلد دوم ص 975)

دوسری صحیح حدیث میں آتا ہے کہ نماز میں آپ نے ہاتھ بڑھایا اور کسی چیز کو پکڑنا چاہا پھر نماز کے بعد صحابہ کے استفسار پر آپ ﷺ نے فرمایا میں نے جنت کو دیکھا تو اس سے ایک خوشہ توڑنا چاہا۔اگر میں لے لیتا تو تم رہتی دنیا تک کھاتے رہتے (بخاری کتاب الاذان) ان آیات اور احادیث سے ثابت ہوا کہ جب یہاں سے بیٹھ کر حضور ﷺ ساتوں آسمانوں کے اوپر جنت اور حوض کوثر کو دیکھ رہے ہیں اور وہاں تک آپ کا ہاتھ بھی پہنچ سکتا ہے تو پھر روضہ شریف میں رہ کر سارے جہاں میں پھیلے ہوئے اپنے غلاموں کو کیوں نہیں دیکھ سکتے......؟ ان تک آپ کا ہاتھ کیوں نہیں پہنچ سکتا......؟ قرآن وحدیث سے یہ چیز ثابت ہوگئی کہ ہمارے احوال پر آپ کی نگاہ بھی ہے اور ہماری فریاد پر آپ کو ہماری دستگیری کی طاقت وقدرت بھی ہے......!

☆☆

آیت نمبر (14)

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا (نور:63)

رسول کے پکارنے کو ایسا نہ بنالو جیسا تم ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔

فوائد

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں منع فرمادیا کہ ہم نبی کو اس طرح پکاریں جس طرح آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہیں۔یعنی آپس میں ہم ایک دوسرے کا نام لے کر

اور عام الفاظ سے پکارتے ہیں۔ مثلاً بھیا، چچا جی، بابا، بابو جی، اے میاں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن حضور ﷺ کو آپ کا نام لے کر یا محمد یا احمد وغیرہ کہہ کر پکارنے کی اجازت نہیں اور نہ حضور ﷺ کے لئے ''بشر'' جیسے عام الفاظ استعمال کرنے کی اجازت ہے۔ بلکہ اس آیت میں حکم دیا جارہا ہے کہ حضور ﷺ کو ادب واحترام والے القاب کے ساتھ پکارو۔ یعنی یا رسول اللہ، یا حبیب اللہ، یا رحمت للعالمین کہو۔ لہٰذا ثابت ہوگیا کہ اس آیت کے بموجب اور رب کے حکم کے مطابق نہ حضور ﷺ کو یا محمد یا احمد نام لے کر پکارنا چاہئے اور نہ حضور ﷺ کے لئے عام الفاظ مثلاً آپ ہمارے جیسے بشر ہیں یا آپ ہمارے بڑے بھائی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے الفاظ بھی حضور ﷺ کی شان کے لائق نہیں اور ان عامیانہ الفاظ کا استعمال حضور ﷺ کے لئے جائز نہیں۔ قرآن وحدیث میں جہاں بھی نبی کے لئے ''بشر مثلکم'' آیا ہے وہ یا تو رب نے ان کو کہا ہے یا خود نبی نے اپنے آپ کو کہا ہے۔ جب کہ رب ان کا خالق ہے اس کو ہی نبیوں کے لئے یہ الفاظ کہنے کا حق ہے اور بطور تواضع خود نبیوں کو بھی اپنے لئے یہ کہنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن اس کو دیکھ کر کسی عام آدمی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ بھی نبی کو اپنے جیسا کہنے لگے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی بادشاہ کوئی حاکم یا بڑا افسر لوگوں سے بطور تواضع کے کہے کہ میں آپ کا خادم ہوں تو وہ کہہ سکتا ہے لیکن اس کو سن کر دوسرے بھی اگر اس کو اپنا خادم کہنے لگیں تو وہ بے ادب اور لائق سزا ٹھہریں گے۔ یہی حال یہاں ہے کہ نبی نے بطور تواضع کے اپنے آپ کو فرمایا کہ ہم تم جیسے بشر ہیں۔ اب یہ سن کر بعض بے ادبوں نے بھی نبیوں کو ایسا کہنا شروع کر دیا تو قرآن کہتا ہے وہ اس بے ادبی پر کافر ہوگئے فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ یَّهْدُوْنَنَا٘ فَكَفَرُوْا تو انہوں نے کہا کہ کیا (یہ) بشر ہمیں ہدایت کرے گا؟ تو وہ کافر ہوگئے (تغابن :6) لہٰذا اگر کوئی نبی کو اپنے جیسا بشر کہے یا عام سا لفظ ان کے لئے استعمال کرکے ان کی توہین کرتا ہو تو وہ اپنے ایمان کی فکر کرے کہ کہیں ان کا ایمان نہ چلا جائے اور اس آیت کی رو سے کہیں وہ کافر ہی نہ ہو جائے۔

اس آیت مبارکہ سے دوسرا سب سے اہم فائدہ اور سبق ہمیں یہ حاصل ہوا کہ نبیوں

اور ولیوں کو پکارنا جائز ہے۔ کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس طرح آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو اس طرح نہ پکارو یعنی عام الفاظ سے اور نام لے کر نہ پکارو بلکہ اچھے القاب سے یا رسول اللہ یا رحمت للعالمین کے پیارے پیارے القاب سے پکارو۔ ثابت یہ ہوا کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ نبیوں اور ولیوں کو پکارنا اور یا رسول اللہ کہنا شرک ہے وہ غلط ہے بلکہ اچھے القاب کے ساتھ نبی کو پکارنا اور یا رسول اللہ کہنا نہ صرف جائز بلکہ قرآن کی اس آیت پر عمل کرنے کے باعث لائق اجر وثواب ہے......!

بلکہ ایک مقام پر تو قرآن میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنے نبی کو پکارنے کا حکم دیا اور فرمایا قُلْ يَآ أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا اے حبیب آپ فرما دیجئے کہ اے لوگو بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔ (اعراف:158) جب کہ لوگوں سے مراد قیامت تک آنے والے تمام انسان مراد ہیں جو حضور ﷺ کے سامنے تھے وہ بھی اور جو دنیا جہاں کے دوسرے کونوں اور علاقوں میں تھے وہ بھی اور جو حضور ﷺ کے زمانہ میں تھے وہ بھی اور جو بعد میں قیامت تک آنے والے ہیں وہ بھی۔ ان سب لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ اے محبوب آپ ان سب سے کہئے کہ يَآ أَيُّهَا النَّاسُ یعنی اے لوگو میں اللہ کا رسول ہوں۔ تو اگر کسی غیر اللہ کو یا کہہ کا پکارنا اور بلانا اور ان کو مخاطب کرنا شرک ہوتا حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ يَآ أَيُّهَا النَّاسُ کہہ کے تمام دور و نزدیک اور حاضر و غائب لوگوں کو پکارنے اور ان کو مخاطب کرنے کا حکم بھی نہیں دیتا......! جب کہ یہاں اللہ تعالیٰ سب لوگوں کو يَآ أَيُّهَا النَّاسُ کہہ کے پکارنے کا اپنے محبوب کو حکم دے رہا ہے تو ثابت ہوا کہ کوئی دور ہو یا نزدیک کوئی حاضر ہو یا غائب کوئی اس دنیا میں ہو یا دوسرے جہاں میں ہو سب کو ''یا'' کہہ کے پکارنا شرک اور بدعت نہیں بلکہ اللہ کی اور اس کے رسول کی سنت ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو ''یا ایھا الرسول'' اور يَآ أَيُّهَا النَّبِيُّ کہہ کے کئی بار قرآن پاک میں پکارا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ حضور ﷺ کو یا محمد یا رسول اللہ کہہ کے پکارنا شرک نہیں بلکہ مشکلیں حل کرنے والا وظیفہ ہے۔ چنانچہ صحیح حدیث میں آتا

ہے کہ ایک روز حضرت عبداللہ بن عمر کا پاؤں سن ہو گیا تو کسی نے ان سے کہا کہ اس کو یاد کرو جو تمہیں سب سے زیادہ پیارا اور محبوب ہو تو انہوں نے اسی وقت کہا یا محمد ﷺ تو یہ کہتے ہی ان کا پاؤں اسی وقت ٹھیک ہو گیا۔ (الادب المفرد لامام بخاری ص 142)

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بھی پاؤں سن ہو گیا تھا اور انہوں نے بھی ''یا محمداہ'' کہا تو ان کا پاؤں بھی ٹھیک ہو گیا (شرح مسلم لنوی، کتاب الاذکار ص 36)

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے حضور ﷺ کے وصال کے بعد حضور کو اپنے اس شعر میں ''یا'' سے پکارا۔

الا یا رسول اللّٰہ کنت رجائنا
و کنت بنا بر و لم تک جافیا

(زرقانی 284/8)

یارسول اللہ ﷺ آپ ہماری امید گاہ تھے اور آپ ہم پر شفیق تھے اور سخت نہ تھے......

کربلا کے میدان میں حضرت بی بی سیدہ زینب رضی اللہ عنہا نے اپنے بھائی امام حسین رضی اللہ عنہ کی خون آلود زخموں سے چور لاش مبارک کو دیکھ کر اپنے نانا جان امام الانبیاء ﷺ کو یوں پکارا......یَا مُحَمَّدَاہ یَا مُحَمَّدَاہ صَلّٰی عَلَیْکَ اللّٰہُ وَ مَلَکُ السَّمَاءِ ھٰذَا حُسَیْنٌ بِالْعَرَاء مُذَیَّلٌ بِالدِّمَاءِ مُقَطَّعُ الْاَعْضَاءِ یَا مُحَمَّدَاہُ وَبَنَاتُکَ سَبَایَا وَ ذُرِّیَّتُکَ مَقْتَلَة تَسْفِیْ عَلَیْھَا الصَّبَا ...... یَا مُحَمَّدَاہ ......! یَا مُحَمَّدَاہ ......!

آپ پر اللہ اور آسمانوں کے فرشتوں کا درود ہو یہ حسین بے گور و کفن پڑے ہیں۔ خون آلود و اعضاء بریدہ۔ یا محمداہ......! آپ کی بیٹیاں قیدی ہیں اور آپ کی اولاد کو قتل کر دیا گیا ہے اور ان پر ہوا خاک ڈال رہی ہے۔ (البدایہ والنہایہ ج 8 ص 193)......امام زین العابدین رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی بارگاہ میں آپ کو پکارتے ہوئے یوں فریاد کی۔

یَارَحْمَتً لِّلْعَالَمِیْنَ اَدْرِکْ لِزَیْنِ الْعَابِدِیْنَ
مَحْبُوْسُ اَیْدِی الظَّالِمِیْنَ فِیْ مَوْکَبٍ وَّ الْمُنْدَھِمِ

اے رحمت للعالمین زین العابدین کی مدد کو پہنچو اس اژدہام میں وہ ظالموں کے ہاتھوں قید میں ہے۔ الغرض ثابت یہ ہوا کہ اللہ کے علاوہ اس کی مخلوق میں سے نبیوں اور ولیوں کو "یا" سے پکارنا نہ تو شرک ہے اور نہ ہی بدعت ہے بلکہ اہل بیت اطہار و صحابہ کرام اور حضور اکرم ﷺ بلکہ خود رب کائنات کی سنت ہے۔ لہٰذا اہل سنت و جماعت جو "یارسول اللہ" کہہ کے حضور ﷺ کو پکارتے ہیں یا "یا شیخ عبدالقادر جیلانی" کہہ کے حضرت غوث پاک رحمت اللہ تعالیٰ علیہ کو پکارتے ہیں یہ شرک اور بدعت نہیں بلکہ قرآن و احادیث سے اس کا جواز ثابت ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان آیات اور احادیث سے تو غیر خدا کو پکارنا جائز ثابت ہوتا ہے جب کہ قرآن کی دوسری آیات میں غیر خدا کو پکارنے سے منع کیا گیا ہے۔ مثلاً قرآن میں آتا ہے فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾ اور اللہ کے ساتھ کسی کو نہ پکارو (جن) اور دوسری آیت میں ہے وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ یَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہے جو اللہ کے سوا کسی کو پکارے (الاحقاف:5) تو ان آیات اور پچھلی آیات اور احادیث میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے......؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ان آیات اور احادیث میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ جن آیات میں غیر اللہ کو پکارنے سے منع کیا گیا ہے اس سے مراد ہے معبود سمجھ کر پکارنا یعنی ان کو پوجنا اور ان کی عبادت کرنا۔ ایسا پکارنا منع ہے اور بغیر معبود سمجھے پکارنا جائز ہے۔ وہ خود قرآن و حدیث اور صحابہ کرام کے اقوال و افعال سے ثابت ہے۔ جیسا کہ آیات اور احادیث ابھی گزریں اور عقل بھی یہی کہتی ہے کہ اگر ہر قسم کا پکارنا منع اور حرام ہو تو انسان دن میں نہ جانے کتنی ہی مرتبہ اپنی بیوی بچوں اور ملازموں کو بلاتا ہے اور پکارتا ہے۔ یہ سب حرام ہو جائیں گے۔ حالانکہ ان میں سے کوئی بھی حرام نہیں۔ پتہ یہ چلا کہ قرآن میں جس بلانے کو حرام قرار دیا ہے وہ خاص قسم کا پکارنا ہے اور وہ معبود سمجھ کر پکارنا ہے، یہ حرام ہے اس کے سوا ہر قسم کا پکارنا خواہ کسی کو قریب سے پکارا جائے یا دور سے مرنے سے پہلے پکارا جائے یا مرنے

کے بعد اگر معبود سمجھ کر نہیں پکارا تو یہ سب جائز ہے۔

☆☆

آیت نمبر (15)

قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا ؕ (سورہ بقرہ:260)

اللہ نے فرمایا تو اچھا چار پرندے لے کر اپنے ساتھ ملا لو پھر ان کا ایک ایک حصہ ہر پہاڑ پر رکھ دو پھر انہیں بلاؤ تو وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے چلے آئیں گے۔

فوائد

اس آیت مبارکہ میں حضرت ابراہیمؑ کا واقعہ بیان کیا جا رہا ہے کہ انہوں نے اللہ سے عرض کیا کہ آپ مجھے دکھایئے کہ مردوں کو کیسے زندہ کریں گے۔ میں اس منظر کو اپنی آنکھ سے دیکھنا چاہتا ہوں تا کہ میرے دل کو قرار و طمانیت حاصل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اچھا ایسا کرو چار پرندے لو اور انہیں خوب کھلا پلا لو پھر انہیں ذبح کر کے ان کا قیمہ بنا کر چند پہاڑوں پر ان کا تھوڑا تھوڑا گوشت رکھ دو پھر ان مرے ہوئے پرندوں کو پکارو تو وہ دوڑتے ہوئے تمہارے پاس آ جائیں گے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی طرح کیا۔ جب ان چاروں کا گوشت پہاڑوں پر رکھ دیا تو پھر ایک ایک مردہ جانور کو اور پرندے کو اس طرح پکارا...... اے مرغ...... اے کبوتری...... اے گدھ...... اے مور...... تو وہ سب پرندے زندہ ہو کر دوڑتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آ گئے۔

اس واقعہ سے ثابت ہوا کہ "مردوں" کو پکارنا جائز ہے۔ بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ مردوں کو پکارنا شرک ہے۔ لیکن اس آیت سے ثابت ہوا کہ مردوں کو پکارنا شرک نہیں۔ کیونکہ یہاں اللہ تعالیٰ نے خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ ان مردہ پرندوں کو پکارو اور بلاؤ۔ اگر مردوں کو پکارنا شرک ہوتا تو نہ اللہ تعالیٰ ان کو یہ شرک کرنے کا حکم دیتا اور نہ

حضرت ابراہیم جیسا نبی یہ شرکیہ کام کرتا۔ پتہ یہ چلا کہ مردوں کو پکارنا شرک نہیں بلکہ نبیوں کی سنت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے اولوالعزم صحابہ کرام نے حضور اکرم ﷺ کے اس عالم سے پردہ فرمانے کے بعد آپ کو بار بار مدد کے لئے پکارا اور آپ ﷺ نے ان کی مدد فرمائی۔ اگر وفات کے بعد کسی کو پکارنا شرک ہوتا تو صحابہ کیوں پکارتے......؟ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے وصال شریف کے بعد جب نبوت کا دعویٰ کرنے والا جھوٹا نبی مسیلمہ کذاب سے مسلمانوں کی جنگ ہوئی تو اس کے پاس اس وقت ساٹھ ہزار فوج تھی۔ جب کہ مسلمانوں کے پاس اس وقت میدان میں بہت کم فوج تھی۔ دشمن کی اتنی بڑی فوج کے حملہ کے باعث مسلمانوں کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اس وقت میدان جنگ میں اسلامی فوج کے سپہ سالار حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کو مدد کے لئے یہ کہہ کر پکارا" یا محمداہ......! یا محمداہ......! اسی وقت حضور ﷺ کی مدد پہنچی اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو دشمن کی اتنی بڑی فوج پر فتح و نصرت عطا فرمادی اور مسیلمہ کذاب مارا گیا اور واصل بجہنم ہوگیا۔ (البدایہ والنہایہ 324/6- ابن اثیر 152/2- طبری 250/3)

اس واقعہ سے ثابت ہوا کہ غیر اللہ کو پکارنا، نبی کو پکارنا، دور سے پکارنا وصال کے بعد پکارنا، مدد کے لئے پکارنا، ان میں سے کوئی بھی چیز شرک و بدعت نہیں بلکہ صحابہ کی سنت ہے۔ اسی طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت میں جب قحط پڑا اور بارش نہ ہونے سے لوگ بھوکے پیاسے مرنے لگے تو ایک شخص نے حضور ﷺ کے روضہ انور پر حاضر ہو کے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اپنی امت کے لئے اللہ سے بارش طلب فرمایئے ورنہ آپ کی امت ہلاک ہوجائے گی۔ چنانچہ حضور ﷺ اس کو خواب میں ملے اور فرمایا عمر کے پاس جاؤ اور ان کو میرا اسلام کہو اور ان کو بارش کی بشارت دو۔ (البدایہ والنہایہ 92/7)

ثابت ہوا کہ وصال کے بعد بھی اللہ کے پیاروں کو پکارنا ان سے مدد طلب کرنا جائز ہے اور اللہ کے پیاروں کا اپنی قبروں میں رہ کر مدد فرمانا برحق ہے۔ جیسے یہاں حضور ﷺ نے

اس کی فریاد کو سن کر اس کی مدد فرمائی۔ اگر وصال کے بعد مدد کے لئے پکارنا شرک ہوتا تو حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمت اللہ علیہ جن کے ہم مقلد ہیں اور حنفی کہلاتے ہیں وہ کبھی بھی اپنے اس شعر میں حضور ﷺ کو پکار کر آپ سے فریاد نہ کرتے، آپ فرماتے ہیں۔

يَااَكْرَمَ الثَّقَلَيْنِ يَا كَنْزَ الْوَرٰى
جُدْ لِيْ بِجُوْدِكَ وَارْضِنِيْ بِرِضَاكَ
اَنَا طَامِعٌ بِالْجُوْدِ مِنْكَ وَلَمْ يَكُنْ
لِاَبِيْ حَنِيْفَةَ فِي الْاَنَامِ سِوَاكَ

اے ساری مخلوقات سے بزرگ ترین، اے نعمت الٰہی کے خزانے، اپنی سخاوت سے مجھے بھی نواز دیجئے اور اپنی رضا سے مجھے بھی شادکام فرمائیے۔ میں آپ کی سخاوت کا امیدوار ہوں، کیونکہ تمام مخلوقات میں ابوحنیفہ کا آپ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ (مجموعہ قصائد ص 42)

...... عبدالرحمٰن جامی رحمت اللہ تعالیٰ علیہ جیسے عارف کامل نے حضور ﷺ سے فریاد کرتے ہوئے یوں پکارا۔

ز رحمت کن نظر بر حال زارم یا رسول اللہ
غریبم بے نوایم خاکسارم یا رسول اللہ

(کلیات جامی)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمت اللہ تعالیٰ علیہ نے حضور ﷺ سے استغاثہ کرتے ہوئے اشعار کی زبان میں یوں کہا۔

وَ صَلّٰى عَلَيْكَ اللّٰهُ وَيَا خَيْرَ خَلْقِهٖ
وَيَا خَيْرَ مَامُوْلٍ وَ يَا خَيْرَ وَاهِبٍ
وَ يَا خَيْرَ مَنْ يُرْجٰى لِكَشْفِ رَزِيَّةٍ
وَمَنْ جُوْدُهٗ فَاقَ جُوْدَ السَّحَائِبِ

اے افضل خلائق ذات آپ پر اللہ کا درود ہو، اے بہترین امیدگاہ اور بہترین عطاء

فرمانے والے، اے وہ بہترین ذات جس سے مصیبتوں اور آفتوں سے نجات دلانے کی امید کی جاتی ہے اے وہ کہ جس کی سخاوت برسنے والے بادلوں سے بھی کہیں زیادہ ہے۔

(اطیب النعم)

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمت اللہ تعالیٰ علیہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں یوں فریاد کناں ہیں۔

یا محمد مصطفیٰ فریاد ہے
اے حبیب کبریا فریاد ہے
سخت مشکل میں پھنسا ہوں آج کل
اے میرے مشکل کشا فریاد ہے

مولوی اشرف علی تھانوی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مدد طلب کرتے ہوئے یوں پکارتے ہیں۔

يَا شَفِيْعَ الْعِبَادِ خُذْ بِيَدِیْ
اَنْتَ فِی الْاِضْطِرَارِ مُعْتَمِدِیْ
لَيْسَ لِیْ مَلْجَاءٌ سِوَاکَ اَغِثْ
مَسَّنِیْ الضُّرُّ سَيِّدِیْ وَ سَنَدِیْ

اے بندوں کی شفاعت فرمانے والے، میری دستگیری فرمایئے۔ آپ مشکلات میں میری آخری امید ہیں، آپ کے سواء میرا کوئی ملجاء و ماویٰ نہیں، اے میرے آقا میری فریاد سنیئے، میں تکلیف و مصیبت میں گرفتار ہوں۔

نواب صدیق حسن خان حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مشکل کشا سمجھتے ہوئے یوں پکارتے ہیں۔

يَا سَيِّدِیْ يَا عُرْوَتِیْ وَ وَسِيْلَتِیْ
يَا عُدَّتِیْ فِیْ شِدَّةٍ وَ رُخَاءٍ
شَفَّعْتُ جَاهَکَ ضَارِعًا مُتَذَلِّلاً
مَا لِیْ وَرَائَکَ صَارِفَ الضَّرَّاءِ

اے میرے آقا، اے میرے سہارے اور میرے وسیلہ، اے میری سختی و نرمی کی حالت کے ساز و سامان، میں نے نہایت عاجزی و انکساری سے آپ کی عزت و جاہ کو شفیع بنایا، کیونکہ میرے لئے آپ کے سوا تکالیف و مصیبت کو کوئی دفع کرنے والا نہیں۔ یعنی آپ کے سوا کوئی مشکل کشا نہیں۔

الغرض آیات و احادیث اور صحابہ و تابعین، تبع تابعین، ائمہ، صوفیاء، علماء اور عرفاء کے اقوال و اشعار سے ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو پکارنا، وصال کے بعد پکارنا، نزدیک سے پکارنا یا دور سے پکارنا، مدد کے لئے، ان سے استغاثہ کرنا، فریاد کرنا، ان کو مشکل کشا کہنا، ان میں سے کوئی سی بھی چیز شرک نہیں بلکہ جائز اور تمام اسلاف کی سنت ہے۔

☆☆

آیت نمبر (16)

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾

"پھر جب عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے کفر کو محسوس کیا تو آپ نے کہا کون میرے مددگار بنتے ہیں اللہ کی طرف، حواریوں نے کہا کہ ہم مدد کرنے والے ہیں اللہ کے دین کی، ہم ایمان لائے اللہ پر آپ (اے نبی) گواہ ہو جائیں کہ ہم مسلمان ہیں"۔ (آل عمران)

فائدہ

اس آیت مبارکہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے حواریوں اور ساتھیوں سے مدد طلب کر رہے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ اللہ کے علاوہ کسی اور سے مدد طلب کرنا کفر اور شرک نہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ غیر اللہ سے مدد مانگنا شرک ہے۔ حالانکہ ان کا یہ کہنا غلط ہے۔ اگر غیر اللہ سے مدد مانگنا شرک ہوتا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو شرک مٹانے کے لئے آئے

تھے وہ کبھی اپنے حواریوں سے جو غیر اللہ ہیں مدد طلب نہ کرتے......!

اسی طرح دوسرے مقام پر مسلمانوں کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ ارشاد فرما رہا ہے کہ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اور اگر وہ (مسلمان تم سے دین میں مدد طلب کریں (جہاد میں) تو تم پر ان کی مدد کرنا واجب ہے۔ (انفال:72) یہاں اس آیت میں بھی مسلمان اللہ تعالیٰ سے نہیں بلکہ اپنے مسلمان بھائیوں سے جو غیر اللہ ہیں ان سے مدد طلب کر رہے ہیں اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرماتا کہ وہ مشرک ہو گئے میرے بجائے تم سے مدد طلب کر رہے ہیں۔ لہٰذا ان کی مدد نہ کرو۔ بلکہ فرماتا ہے کہ اپنے ان مسلمان بھائیوں کی مشکل کے وقت میں مدد کرنا تم پر واجب ہے۔ ان دونوں آیات سے ثابت ہوا کہ مشکل کے وقت غیر اللہ سے مدد طلب کرنا کفر وشرک نہیں بلکہ انبیاء اور صحابہ کی سنت ہے اور اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ خود نبی کریم ﷺ نے بھی غیر اللہ سے مدد مانگنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب کسی کا جانور وغیرہ جنگل میں بھاگ جائے یا کوئی حاجت پیش آئے اور مدد کی ضرورت ہو تو اسے چاہئے کہ یوں کے...... يَا عِبَادَاللّٰهِ اَعِيْنُوْنِي يَا عِبَادَاللّٰهِ اَعِيْنُوْنِي...... یعنی اے اللہ کے بندو میری مدد کرو اے اللہ کے بندو میری مدد کرو۔

اسی مضمون کی حدیث دیگر صحابہ کرام سے بھی روایت ہے۔ (طبرانی / ابو یعلی / فتاوی رشیدیہ / حصن حصین / مجمع الزوائد) اور اس حدیث کے متعلق علامہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے اور حاجت روائی کے سلسلہ میں بڑی مجرب ہے۔ (الحرز الثمین) اسی طرح ایک جنگ میں بطلیموس بادشاہ نے دس ہزار کی فوج کے ساتھ مسلمانوں کے لشکر پر رات کے وقت اچانک حملہ کر دیا جس سے مسلمان گھبرا گئے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اسی وقت حضور ﷺ کو مدد کے لئے پکارا اور کہا...... وَاغَوْثَاهُ وَا مُحَمَّدَاهُ وَاسَلَامَاهُ كِيْدَ قَوْمِيْ وَرَبُّ الْكَعْبَةِ...... اے محمد رب کعبہ کی قسم میری قوم کے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے ہماری مدد فرمائیے ہماری فریادرسی کیجئے تا کہ یہ

سلامت رہیں۔ (واقدی) اس سے ثابت ہوا کہ صحابہ کرام حضور ﷺ کے وصال کے بعد بھی آپ کو نداء کر کے آپ سے استمداد کرتے تھے۔ مشکل وقت میں آپ سے مدد طلب کرتے تھے اور حضور ﷺ کے صدقہ میں ان کی مشکلیں آسان ہو جاتی تھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب قرآن کی آیات اور احادیث سے ثابت ہو گیا کہ اللہ کے علاوہ کسی اور سے بھی مدد طلب کرنا جائز ہے اور نبیوں اور صحابہ نے مدد یں طلب کی ہیں تو پھر قرآن میں یہ کیوں فرمایا گیا ہے کہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ۝ کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں۔ اس آیت سے پتہ چل رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ نہ کسی کی عبادت جائز ہے نہ کسی سے استعانت اور مدد طلب کرنا جائز ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں حقیقی مدد مراد ہے۔ یعنی اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ کے معنی یہ ہیں کہ حقیقی کارساز سمجھ کر صرف تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں۔ حقیقی مدد کرنے والا صرف وہی ہے۔ باقی انبیاء و اولیاء جو بھی مدد کرتے ہیں اور ان سے جو مدد طلب کی جاتی ہے وہ اللہ کا مظہر سمجھ کر محض واسطہ سمجھ کر ان سے مدد طلب کی جاتی ہے۔ اور اس طرح یعنی کسی کو اللہ کا مظہر سمجھ کر ان سے مدد طلب کرنا شرک نہیں۔ ہاں اللہ کے مقابلہ میں اس جیسا خدا معبود جان کر مدد طلب کرنا جیسا کہ مشرکین عرب بتوں کو معبود سمجھ کر مدد طلب کرتے تھے۔ ایسا کرنا شرک ہے۔ اگر اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ کے یہ معنی لئے جائیں کہ کسی کی کسی سے مدد طلب کرنا شرک ہے تو دن میں آدمی نہ معلوم کتنے کاموں میں لوگوں سے مدد طلب کرتا ہے۔ کہیں بیوی سے کھانا طلب کرتا ہے تو بچوں سے پانی منگواتا ہے، حکیم سے دوا لیتا ہے، وکیل سے پولیس تھانہ دار سے، ایم پی اے، ایم این اے وغیرہ سے سینکڑوں کاموں میں مدد طلب کرتا ہے تو کیا یہ سب شرک ہو گیا اور اس طرح تو دنیا میں کوئی بھی مسلمان نہیں رہا۔ معلوم ہوا کہ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ کے معنی یہ ہیں کہ حقیقی مددگار سمجھ کر صرف خدا کی مدد طلب کی جاتی ہے۔ اسی طرح ایک اور آیت میں فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ کے سوا تمہارا کوئی دوست اور مددگار نہیں" جبکہ دوسری آیت میں فرمایا کہ اللہ اس کا رسول اور مومنین تمہارے دوست ہیں۔ (المائدہ:155/5)

ان دونوں آیتوں کے درمیان بھی کوئی تعارض نہیں کیونکہ جن آیات میں اللہ کے علاوہ کسی کے مددگار نہ ہونے کا ذکر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں کوئی مددگار نہیں۔ خواہ کوئی نبی ہو یا ولی جو بھی مدد کرتے ہیں وہ اللہ کے حکم اور اس کی اجازت سے اس کی طاقت سے مدد کرتے ہیں۔

آیت نمبر (17)

وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ﴿٥٩﴾ (توبہ)

"اور کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ راضی ہو جاتے اس چیز پر جو اللہ اور اس کے رسول نے ان کو دی اور وہ کہتے کہ اللہ ہمیں کافی ہے ہمیں عنقریب دے گا اللہ اپنے فضل سے اور اس کا رسول، بے شک ہم اللہ ہی کی طرف رغبت کرنے والے ہیں"۔

فوائد

اس آیت سے پہلا فائدہ تو یہ حاصل ہوا کہ یہاں یہ فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے دیتا ہے اور اس کا رسول بھی دیتا ہے اور ان دونوں کے دینے میں کوئی قید نہیں لگائی گئی کہ یہ کیا دیتے ہیں۔ بلکہ مطلق رکھ کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ جو کچھ خدا دیتا ہے وہ مصطفیٰ کے ذریعہ دیتا ہے۔ یعنی خدا کی ہر نعمت ہر ایک کو حضور ﷺ کے ذریعے سے ملتی ہے۔ اسی کو حدیث پاک میں وضاحت کے ساتھ حضور ﷺ نے بیان فرمایا کہ اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰهُ يُعْطِيْ کہ جو کچھ خدا دیتا ہے اس کو تقسیم میں کرتا ہوں۔ (بخاری ج 1 ص 16/ مشکوٰۃ ص 32) معلوم ہوا کہ عزت و دولت، شہرت و اولاد، بیوی بچے، وزارت و حکومت، بادشاہت و ولایت و نبوت الغرض خدا کی ہر عطاء مصطفیٰ کے ذریعہ ملتی ہے۔

اس آیت میں ان لوگوں کی تعریف کی گئی جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ دیتا ہے اور اس کا رسول بھی دیتا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ کی عطاء سے حضور ﷺ بھی عطاء و بخششیں فرماتے ہیں۔ مخلوق کو فائدہ اور نفع پہنچاتے ہیں، ان کی دستگیری فرماتے ہیں، ان کی مشکلیں

آسان کرتے ہیں، ان کو ہر آڑے وقت میں مدد دیتے ہیں، یہ سب عقائد رکھنے والا اللہ کا محبوب اور پسندیدہ ہے اور قرآن ایسے شخص کی تعریف کر رہا ہے جو حضور ﷺ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھے...... بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کسی کو کوئی نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتے وہ مجبور محض ہیں ان کے لئے یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ کچھ دے سکتے ہیں یا کسی کی بگڑی بناسکتے ہیں یا مشکلیں آسان کر سکتے ہیں یہ سب شرک ہے (معاذ اللہ) اور دلیل کے طور پر وہ یہ آیت پیش کرتے ہیں کہ...... قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ......

آپ فرمادیجئے کہ میں اپنی جان کے بھلے یا برے کا خود بخود مختار نہیں مگر جو اللہ چاہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں جو نفع اور نقصان کی نفی کی گئی ہے کہ حضور ﷺ اس کے مالک نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ بغیر اللہ کی عطاء اور اس کی رضا کے مالک نہیں اور کوئی نفع و نقصان نہیں پہنچا سکتا اس کی اجازت کے بغیر۔ ہاں اس کی عطا اس کی رضا اور اجازت سے سب کچھ عطاء کرتا ہوں۔ نعمتیں بھی بانٹتا ہوں اور نفع و نقصان کا مالک بھی ہوں اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاتا ہوں۔ اوپر والی آیت میں اسی کا ذکر ہے کہ اللہ کی عطاء سے حضور ﷺ ہر چیز عطا فرماتے ہیں۔

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ داتا گنج بخش علی ہجویری کو داتا کہنا شرک ہے۔ "داتا" صرف اللہ ہے۔ دوسروں کو داتا ماننا شرک ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ میں بھی داتا ہوں، میرا رسول بھی داتا تو کیا یہ شرک ہو گیا......؟ معلوم ہوا یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ کی عطاء بھی ذاتی ہے اور اس کے محبوبوں کی عطا بھی ذاتی ہے یہ شرک ہے، لیکن یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ تعالیٰ بغیر کسی سے لئے خود بخود دیتا ہے۔ جب کہ اس کے پیارے اپنے رب سے لے کر دیتے ہیں۔ لہٰذا اس کے دینے میں اور ان کے دینے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس کے داتا اور ان کے داتا ہونے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہ عقیدہ رکھنا شرک نہیں بلکہ اللہ کو پسند ہے، اللہ اس کی تعریف کر رہا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے بھی فرمایا کہ میں رؤف و رحیم اور اپنے محبوب

کے لئے بھی فرمایا کہ وہ بھی رؤف ورحیم ہیں، لیکن یہ شرک نہیں کیونکہ وہ خود بخود رؤف ورحیم ہے اور حضور ﷺ اللہ کی عطا سے رؤف ورحیم ہیں۔

☆☆

آیت نمبر (18)

وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ (آل عمران:49)

''اور میں شفاء دیتا ہوں، مادرزاد اندھے اور برص والے کو اور مردے زندہ کرتا ہوں اللہ کے حکم سے اور میں تمہیں خبر دیتا ہوں اس چیز کی جو تم کھاتے ہو اور جو اپنے گھروں میں جمع کرتے ہو''۔

فائدہ

بیماروں کو شفا دینا اور مردے زندہ کرنا یہ سب کام اللہ کے ہیں، لیکن اس آیت میں اللہ کے مقرب نبی حضرت عیسیٰ رضی اللہ عنہ اپنے لئے فرما رہے ہیں کہ میں اندھوں کو اور برص والوں کو شفاء دیتا ہوں اور میں مردوں کو زندہ کرتا ہوں۔ لیکن آگے انہوں نے فرما دیا کہ ''باذن اللہ'' کہ یہ سب کام میں اللہ کے اذن اور اس کے حکم اور اس کی عطا سے کرتا ہوں۔ اس سے ثابت ہوا کہ اللہ کے پیاروں کے لئے یہ کہنا اور عقیدہ رکھنا کہ نبی و ولی مشکل کشا ہیں، پریشانیاں دور کرتے ہیں، مصیبتیں ٹالتے ہیں، بیماروں کو شفاء دیتے ہیں، اولاد دیتے ہیں اور وہ یہ سب کام اللہ کی اجازت اور اذن سے کرتے ہیں۔ تو یہ شرک و بدعت نہیں۔ اگر ایسا کہنا شرک ہوتا تو اللہ کا مقرب اور عظیم نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہرگز ایسا نہیں کہتے۔ ہاں البتہ یہ عقیدہ رکھنا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ بالذات مشکل کشا ہے اور شفا دیتا ہے اور مردے زندہ کرتا ہے۔ اسی طرح اس کے مقابلہ میں اس کے بندے کو بغیر اللہ کے دیئے ہوئے خود بخود یہ قوت حاصل ہے تو یہ شرک ہو جائے گا اور مشرکین عرب اپنے بتوں کے لئے یہی عقیدہ رکھتے تھے۔ اس لئے وہ مشرک ہوئے اور یہی وجہ ان کے شرک کی قرآن نے

بیان کرتے ہوئے فرمایا تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۹۷﴾ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۸﴾ یعنی دوزخ میں مشرکین اپنے بتوں سے کہیں گے کہ اللہ کی قسم ہم کھلی گمراہی میں تھے کیونکہ ہم تو تم کو رب العالمین کے برابر سمجھتے تھے۔ (الشعراء) برابر سمجھنے کے لفظ نے واضح کر دیا کہ عرب کے مشرکین اس لئے کافر ہو گئے کہ وہ بتوں کو خدا کے برابر ٹھہراتے تھے اور خدا کی طرح اس کے مدمقابل مشکل کشا مانتے تھے۔ اس لئے مشرک ہو گئے۔ جب کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے اذن اور اجازت سے یہ سب کام کر رہے ہیں۔ لہٰذا وہ محبوب ٹھہرے۔

لہٰذا آج بھی کوئی اپنے آقا و مولا سرورِ کون و مکان صلی اللہ علیہ وسلم اور اولیاء اللہ کے لئے یہ کہے اور عقیدہ رکھے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں جو اللہ کے اذن و اجازت اور اس کی دی ہوئی طاقت سے مشکلیں آسان کرتے ہیں، بیڑے تراتے ہیں، کشتیاں پار لگاتے ہیں، اولا دیں دیتے ہیں تو یہ شرک نہیں ہوگا بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سنت پر عمل ہوگا۔ ہاں اگر کوئی مشرکین عرب کی طرح یہ عقیدہ رکھے کہ انبیاء و اولیاء بغیر اللہ کے دیئے خود بخود مشکل کشا ہیں تو وہ مشرک ہو جائے گا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی مشکل کشا نہیں، کسی غیر اللہ کو مشکل کشا کہنا شرک ہے، کوئی مصیبت ٹالنے والا نہیں اور اس پر بطور دلیل یہ آیت پیش کرتے ہیں...... وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ...... اور اگر تجھے کوئی برائی پہنچائے تو اللہ کے سوا کوئی اس کا دور کرنے والا نہیں۔ دوسری آیت میں فرمایا...... وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۰۷﴾ ...... اور اس کے سوا تمہارا کوئی حامی و مددگار نہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اللہ کے یہ فرمان بالکل درست ہیں ہمارا ان پر ایمان ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ حقیقی مشکل کشا وہ ہی ہے۔ ''بالذات'' مدد فرمانے والا اور مصیبتیں ٹالنے والا صرف وہی ہے اس کے سوا کوئی نہیں۔ ہاں اس کی عطاء سے اس کی اجازت سے اس کے پیارے بھی مشکلیں آسان کرتے ہیں اور مصیبتیں ٹالتے ہیں اور مدد بھی فرماتے ہیں۔ جیسے مذکورہ بالا آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں بیماروں کو شفا دیتا ہوں اور مردے زندہ کرتا ہوں مگر اللہ کے حکم

سے۔ اسی طرح خود اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اپنے محبوب ﷺ کے لئے فرمایا فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ۝ بے شک اللہ تعالیٰ اپنے نبی کا مددگار ہے اور جبرئیل اور نیک مومنین اور اس کے بعد اس کے فرشتے بھی مدد پر ہیں۔ (التحریم: 4) اگر غیر اللہ کا مددگار ہونا اور مشکلیں آسان کرنا، مصیبتیں ٹالنا شرک ہوتا تو اللہ تعالیٰ قرآن میں کیوں فرماتا کہ مومنین اور ملائکہ اور جبریل حضور ﷺ کے مددگار ہیں۔ ثابت ہوا کہ حقیقی مشکل کشا اور مددگار صرف اللہ ہے اس کے سواء کوئی نہیں۔ جب کہ اس کی عطا اور اذن سے مشکل کشا اور مددگار اس کے پیارے بندے بھی ہیں اور یہ عقیدہ شرک نہیں بلکہ نبیوں کا طریقہ ہے۔

اس آیت مبارکہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا کہ تم جو گھروں میں کھاتے ہو اور جو ذخیرہ کر کے آتے ہو میں اس کو بھی بتا دیتا ہوں۔ معلوم ہوا کہ جو چیزیں ہماری نگاہوں سے اوجھل اور پوشیدہ ہوتی ہیں وہ نبیوں کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہوتیں۔ اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو غیب کا وسیع علم عطا فرما دیا ہے۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے علم کا یہ حال ہے تو پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بھی نبی بلکہ ساری کائنات کے نبی اور امام حضور سرور کون و مکان ﷺ کے علم کا کیا عالم ہوگا۔ اس کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ بس اتنا سمجھ لیجئے کہ ابتدائے آفرینش سے لے کر قیامت تک کے تمام احوال و واقعات کا اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو وسیع علم عطا فرما دیا تھا۔ کوئی شی حضور ﷺ کی نگاہوں سے اوجھل نہیں تھی۔ اسی لئے حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت کو میرے دونوں کندھوں کے درمیان رکھا تو ہر چیز میرے لئے روشن ہوگئی اور کائنات کی ہر شے کا مجھے علم آ گیا اور میں نے اس کو جان لیا اور پہچان لیا۔ (بخاری)

☆☆

آیت نمبر (19)

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ ؕ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ (توبہ)

''اے محبوب اگر آپ ان سے پوچھیں تو وہ کہیں گے کہ ہم تو یوں ہی صرف دل لگی اور کھیل کرتے تھے تو آپ فرمایئے کیا اللہ اور اس کی آیتوں اور اس کے رسول کے ساتھ مزاح کرتے ہو، بہانے نہ بناؤ بے شک تم کافر ہو چکے مسلمان ہو کر''۔

فوائد

اس آیت مبارکہ کا شانِ نزول یہ ہے کہ غزوہ تبوک کے موقع پر بعض منافقین نے حضور ﷺ کے علم غیب کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ حضور ﷺ کہتے ہیں کہ ہم روم پر غالب آجائیں گے بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے......؟ اور اس پر ہنسنے لگے۔ جب حضور ﷺ نے ان کو بلا کر پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کہا تو بہانے کرنے لگے۔ جس کو قرآن بیان کر رہا ہے کہ انہوں نے کہا کہ ہم تو صرف اپنا سفر گزارنے کے لئے یوں ہی ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا تم اللہ تعالیٰ اور اس کی آیتوں اور اس کے رسول کے ساتھ مذاق کرتے ہو۔ جاؤ تم اسلام لانے کے بعد کافر اور مرتد ہو گئے۔

اب اس آیت میں یہ بات قابل غور ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تو مذاق نہیں کیا بلکہ حضور ﷺ اور آپ کے ''علم غیب'' کا مذاق اڑایا اور ان کے اس مذاق اڑانے کو قرآن نے یہ فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کا اور اس کی آیتوں کا مذاق اڑاتے ہو۔ معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کا مذاق اڑانا یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ اور اس کی آیتوں کا مذاق اڑانا ہے۔ حضور ﷺ کی توہین درحقیقت خدا کی توہین ہے۔ لہٰذا جو لوگ توحید کا نام لے کر حضور ﷺ کی گستاخیاں کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے آگے کوئی بڑا ہو یا چھوٹا یعنی نبی ولی سب

چوڑے چمار کی طرح ہیں۔ وہ غور کریں کہ وہ ان عبارات کو لکھ کر توحید کو بلند نہیں کر رہے بلکہ اللہ کے پیاروں کی توہین کر کے اللہ کی توہین کرر ہے ہیں......! اس آیت نے بتادیا کہ اللہ کے یہاں ایسی توحید قابل قبول نہیں جس میں اس کے پیاروں کی توہین ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں صاف فرمادیا کہ میرے نبی کی گستاخی درحقیقت میری ہی گستاخی ہے۔ وہ موحد اور توحید پرست نہیں بلکہ توحید کا منکر ہے اور میرا بھی گستاخ ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس گستاخی پر وہ لوگ جو بظاہر مسلمان تھے وہ کافر اور مرتد ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کی ادنیٰ سی گستاخی پر انسان ایمان اور اسلام سے نکل جاتا ہے اور ایمان نہ رہا تو پھر کسی نیک عمل کا اسے کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ اچھے اعمال کا ثواب تو اسی کو ملے گا جس کا ایمان سلامت ہو۔ ایک کافر کتنے ہسپتال قائم کر کے غریبوں کی مدد کرے اس کے کسی عمل کا اسے ثواب نہیں ملے گا۔ لہٰذا اس آیت سے ثابت ہوا کہ جو نبی کی گستاخی کرتے ہیں وہ کتنی ہی لمبی لمبی نمازیں پڑھیں کتنے ہی صدقہ وخیرات کریں کتنے ہی بڑے بڑے مدرسہ کیوں نہ بنائیں اور چلائیں کتنی ہی تبلیغیں کریں ان کے کسی نیک کام کا ان کو ثواب نہیں ملے گا۔ کیوں کہ ”گستاخ رسول“ کے باعث وہ کافر اور مرتد ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آخرت میں دردناک عذاب سے دوچار ہوں گے۔

☆ ان منافقوں نے حضور ﷺ کے علم غیب کا مذاق اڑایا تھا کہ حضور کہتے ہیں کہ روم غالب آئے گا یہ سب بیکار باتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر عتاب فرمایا اور ان کے اسلام سے نکلنے اور کافر ہونے کا اعلان فرمادیا۔ معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کے علم غیب پر اعتراض کرنا یہ منافقوں کا طریقہ ہے اور ایسے لوگوں پر خدا کا عذاب نازل ہوگا اور علم مصطفیٰ کا مذاق اڑانے والے اسلام سے خارج ہو کر اس آیت کی رو سے کافر ومرتد ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا حضور ﷺ کے علم پر اعتراض کرنے سے آدمی کو ڈرنا چاہیے۔

☆ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَا تَعْتَذِرُوْا بہانے نہ بناؤ تمہارا کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔ معلوم ہوا کہ شان رسالت میں گستاخی اتنا بڑا جرم اور گناہ ہے کہ ہر بڑے سے بڑے

گناہ کا عذر اللہ تعالیٰ قبول فرما کر معافی دے دیتا ہے۔ لیکن اس جرم کے لئے کوئی عذر قبول نہیں فرماتا اور ہر حال میں اس عظیم جرم کے مرتکب افراد کو بڑی دردناک سزا دے گا۔ لہٰذا جو لوگ گستاخانہ عبارتیں لکھ حضور ﷺ کی بے ادبیاں کر کے اس کی تاویلیں کرتے ہیں ان کو سوچنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کی کوئی تاویل کوئی عذر کام نہیں آئے گا اور اس کے محبوب کی گستاخی کے باعث وہ اللہ تعالیٰ کے غضب اور عذاب سے ہرگز ہرگز نہیں بچ سکیں گے۔

☆ اس آیت سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو بڑا وسیع علم غیب عطا فرمایا تھا کہ ان منافقوں نے آپس میں سفر کے دوران خاموشی سے یہ باتیں کیں لیکن حضور ﷺ کو انکی باتوں کا علم ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ امتیوں کے خلوت وجلوت کا کوئی عمل کوئی قول اور کوئی فعل نبی کی نگاہوں سے اوجھل اور مخفی نہیں۔ آج بھی ہر امتی کے اعمال پر حضور ﷺ کی نگاہ ہے۔ کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ آپ امتیوں کی کل قیامت کے دن گواہی دیں گے۔ ظاہر ہے گواہی وہ ہی دے سکتا ہے جو اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ معلوم ہوا کہ حضور ﷺ ہر امتی کو اس کے ہر عمل کو اپنی آنکھوں سے آج بھی دیکھ رہے ہیں۔ جب ہی تو کل ہماری گواہی دیں گے۔

☆ اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اسلام کی ظاہری نشانیاں کتنی ہی کسی آدمی میں کیوں نہ موجود ہوں۔ خواہ وہ کتنا ہی نمازی ہو، حاجی اور غازی ہو لیکن اگر حضور ﷺ کی ادنیٰ سے توہین بھی کرتا ہے یا توہین کرنے والوں کے ساتھ راضی رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق وہ اسلام سے نکل گیا اور مرتد ہو گیا۔ اس کا نماز، روزہ، حج وزکوٰۃ وغیرہ اس کے کوئی کام نہیں آئے گا اور نہ یہ عبادات اس کو کافر اور مرتد ہونے سے بچا سکتی ہیں۔ لہٰذا نمازوں اور روزوں کی وجہ سے اس کو مومن نہ سمجھ لینا۔ گستاخی رسول کے باعث اس کا ایمان نکل چکا ہے۔

☆☆

آیت نمبر (20)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (الحجرات)

"اے ایمان والو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے"۔

فوائد

اس آیت مبارکہ کا شان نزول یہ ہے کہ بعض صحابہ کرام نے عید الاضحیٰ کے دن حضور اکرم ﷺ سے پہلے قربانی کر لی۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اور مسلمانوں کو حضور ﷺ کا ادب سکھلایا گیا اور حکم دیا گیا کہ حضور ﷺ سے پہلے کوئی کام نہ کرو۔ جب حضور ﷺ قربانی فرما چکیں اس کے بعد تم قربانی کرو۔ آگے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرو اور اتنی سی بے ادبی بھی نہ کرو کہ حضور ﷺ سے پہلے کوئی کام کر لو۔ قابل غور ہے یہ بات کہ صحابہ کرام نے قربانی جیسی عظیم عبادت ادا کی تھی وہ بھی صرف اللہ تعالیٰ کے لئے کی تھی۔ تمام شرائط کے ساتھ کی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان کی اس خالص عبادت پر اللہ تعالیٰ بجائے راضی ہونے کے ناراضگی کا اظہار فرما رہا ہے اور اس عبادت کرنے پر ان کو ثواب کے بجائے اپنے عذاب سے ڈرا رہا ہے۔ درحقیقت خدا کو بتانا یہ مقصود تھا کہ میرے لئے کی گئی وہ عبادت ہی مجھے مقبول ہے جو میرے محبوب کے ادب کے ساتھ ہو۔ اگر کسی کے دل میں میرے پیارے نبی کا ادب واحترام نہیں تو وہ ہزار میری عبادتیں کرے، اس کی ساری عبادتیں بے کار ہیں۔ مجھے اس کی کسی عبادت کی ضرورت نہیں اور نہ ہی ایسی عبادت اس کے کچھ کام آئے گی۔

دوسری اہم بات اس آیت مبارکہ میں یہ قابل غور ہے کہ صحابہ کرام نے حضور ﷺ سے پہلے قربانی کی اور آپ سے آگے بڑھے اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ سے آگے نہ بڑھو۔ جب کہ اللہ تعالیٰ جسم و مکاں سے پاک ہے۔ اس سے آگے بڑھنے کا تصور

بھی نہیں ہو سکتا تو اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت یہاں حضور ﷺ کے ادب واحترام کی اہمیت اور عظمت کو اللہ تعالیٰ بتانا چاہتا ہے کہ میرے محبوب کی بے ادبی کو معمولی مت سمجھنا درحقیقت ان سے آگے بڑھنا مجھ سے آگے بڑھنا ہے، ان کی بے ادبی میری بے ادبی ہے تو کتنا ہی توحید کا علمبردار بن جا میری وحدانیت اور عظمت کے کتنے ہی گیت گا لے۔ لیکن اگر میرے محبوب کی گستاخی کرتا ہے تو یہ سمجھ لے کہ تو درحقیقت میری ہی بے ادبی اور گستاخی کر رہا ہے۔ میرا اور میرے محبوب کا معاملہ علیحدہ علیحدہ نہیں۔ ان کا ادب میرا ادب ہے ان کی بے ادبی درحقیقت میری بے ادبی ہے۔ لہٰذا مجھ کو راضی کرنا چاہتے ہو تو میرے محبوب کا ادب کرو میں راضی ہو جاؤں گا۔

☆ تیسری بات یہ ہے کہ یہاں لَا تُقَدِّمُوْا کے اندر مفعول کا ذکر نہیں کیا گیا یعنی قرآن نے مطلقاً فرمایا کہ آگے نہ بڑھو۔ یہ نہیں ذکر فرمایا کہ کس چیز میں آگے نہ بڑھیں......؟ قربانی میں، نماز میں یا کسی اور کام میں......؟ الغرض کس کام میں آگے بڑھنے سے منع کیا جارہا ہے......؟ اس کا ذکر نہیں فرمایا۔ اس میں راز یہ ہے کہ اگر کسی خاص چیز کا ذکر کر دیا جاتا تو یہ حکم اس کے ساتھ مخصوص ہو جاتا۔ مثلاً اگر قربانی کا آیت میں ذکر کر دیا جاتا تو یہ حکم صرف قربانی کے ساتھ خاص ہو جاتا کہ قربانی کرنے میں حضور ﷺ سے آگے مت بڑھو اور حضور سے پہلے قربانی نہ کرو۔ لیکن اب دوسرے امور میں حضور ﷺ سے آگے بڑھنے کی ممانعت ثابت نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس کو مطلق رکھ کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ تم اپنی زندگی کے کسی معاملہ میں بھی حضور ﷺ کے حکم اور حضور کے ارشادات سے اور آپ کی رضا سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرنا خواہ وہ اقتصادی معاملہ ہو، معاشی یا معاشرتی معاملہ ہو سیاسی یا اخلاقی معاملہ ہو، نجی ہو یا اجتماعی معاملہ ہو، قومی ہو یا بین الاقوامی معاملہ ہو، الغرض کسی قول اور کسی فعل میں حضور ﷺ کے حکم، ان کی رضا یعنی کتاب وسنت سے آگے ہونے کی کوشش نہ کرنا بلکہ ہر معاملہ کو کتاب وسنت کی روشنی میں حل کرنے اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے کی کوشش کرنا۔ اسی لئے حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ

تعالیٰ اور اس کے رسول کی سنت کی مخالفت نہ کرنا (تفسیر ابن عباس 322) یعنی ہر دینی اور دنیوی معاملہ میں حضور ﷺ کی رائے کو مقدم رکھنا ادب ہے اور اپنی رائے کو مقدم کرنا بے ادبی ہے۔

☆☆

آیت نمبر (21)

یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَ لَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝۲ (الحجرات)

''اے ایمان والو اپنی آوازیں نبی کی آواز سے اونچی نہ کیا کرو اور نہ زور سے آپ کے ساتھ بات کیا کرو جس طرح زور سے تم ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہو، کہیں ضائع نہ ہو جائیں تمہارے اعمال اور تمہیں خبر تک نہ ہو''۔

فوائد

اس آیت مبارکہ میں حضور سرورِ کون و مکان ﷺ کے ادب واحترام کی اہمیت کو کئی طریقہ سے آشکارا کیا جارہا ہے سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اولاً اور بالذات تو یہ خطاب صحابہ کرام ہی سے ہو رہا ہے اور ان کو بارگاہ مصطفیٰ کے ادب سکھلاتے ہوئے قرآن تنبیہہ فرما رہا ہے کہ خبردار نبی کی آواز سے تمہاری آواز اونچی نہیں ہونی چاہیے۔ آواز اونچی ہو گئی تو اتنی سی بے ادبی پر تمہارے سارے نیک اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ حالانکہ یہ وہ صحابہ کرام ہیں جو حضور ﷺ پر اپنے جان و دل عزیز واقارب سب کچھ قربان کر دیتے تھے۔ ان سے یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ کسی بے ادبی کی غرض سے قصداً ایسا کریں گے لیکن ان کو یہ حکم دے کر درحقیقت یہ بتانا مقصود تھا کہ میرے محبوب کی بارگاہ کی بڑی عظمت ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ محبت کے اندر اور جنونِ عشق کی وارفتگی کے اندر تم سے کوئی ایسا فعل سرزد ہو جائے جو اس بارگاہ کے ادب کے خلاف ہو۔ لہٰذا دیکھنا خبردار عشق ومحبت کے اندر بھی دامنِ ادب

تمہارے ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے اور اس عظیم بارگاہ کے ادب کا اس وقت بھی خیال رکھنا اور اس کی تعظیم میں کوئی فرق نہ آنے دینا۔ ادھر دنیا والوں کو اس سے یہ سبق دیدیا کہ اس عظیم بارگاہ کی معمولی سی بے ادبی اگر صحابہ کرام جیسے جان نثاروں سے وہ بھی غیر ارادی اور محبت کے اندر سرزد ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ بھی قابل معافی نہیں اور اس کی سزا بھی یہ ہے کہ سارے نیک اعمال ضائع ہو جائیں گے تو پھر دوسروں کی کیا حیثیت ہے اور ان کی گستاخی کب خدا کو گوارا ہو سکتی ہے۔

اپنے محبوب کی کوئی توہین بھی
خالق دو جہاں کو گوارا نہیں

☆ دوسری اہم بات یہاں یہ قابل توجہ ہے کہ رب کا قانون تو یہ ہے کہ اگر کوئی برائی یا گناہ کرے گا تو اس کے نامہ اعمال میں وہ برائی لکھ دی جائے گی۔ خواہ وہ کتنا ہی بڑا گناہ کیوں نہ کرے وہ گناہ ضرور لکھا جائے گا۔ لیکن ان گناہ کی وجہ سے جو اس نے اچھے اعمال کئے ہیں وہ ضائع نہیں کئے جائیں گے۔ مثلاً کسی نے شراب پی لی تو اس کا اس کو سخت گناہ ہو گا لیکن اس گناہ کی وجہ سے اس نے جو نمازیں پڑھی ہیں، روزے رکھے ہیں وہ ضائع نہیں ہوں گے۔ لیکن تعظیم مصطفیٰ کی اہمیت اور عظمت دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے کہ اگر میرے محبوب کی معمولی سی بے ادبی بھی تم سے ہو گئی تو یہ ایک ایسا عظیم جرم ہے کہ اس کی وجہ سے اب تک تم نے جو نیکیاں کی ہیں وہ سب ضائع ہو جائیں گی۔ تمہارے سارے اچھے اور نیک اعمال برباد ہو جائیں گے۔ لہٰذا ادب مصطفیٰ میں ذرا سی کوتاہی بھی نہ آنے دینا اور یہ گھمنڈ نہ کرنا کہ میں نے تو بڑی نیکیاں کی ہیں تو نماز، روزوں، حج، زکوٰۃ اور تبلیغوں کی وجہ سے بخشا جاؤں گا۔ ہرگز نہیں کیونکہ حضور ﷺ کی گستاخی کی وجہ سے تمہاری ساری نیکیاں برباد چلی جائیں گی اور تمہاری بخشش کا کوئی راستہ نہیں رہے گا۔

☆ اب سوال یہ ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ حضور ﷺ کی بے ادبی کی وجہ سے سارے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں۔ جب کہ کسی اور گناہ کی وجہ سے نیک اعمال ضائع نہیں

ہوتے......؟ علمائے کرام فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ادنیٰ سی گستاخی انسان کو کافر اور مرتد کر دیتی ہے جب کہ کفر اور ارتداد ایسی چیز ہے جو پچھلے سارے نیک اعمال کو ضائع کر دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں آتا ہے وَمَنْ یَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَیَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾ یعنی جو مرتد ہو کر کفر پر مرے گا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اس کے سارے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور ایسے لوگ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ (بقرہ) اس سے ثابت ہوا کہ نیک اعمال کفر اور ارتداد کی وجہ سے ضائع ہو جاتے ہیں اور یہاں اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ میرے محبوب کی معمولی سی بے ادبی بھی کی تو تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ اس سے پتہ چلا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے ادبی سے آدمی کافر اور مرتد ہو جاتا ہے۔ اسی لئے اس کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں اور دنیا و آخرت میں اس کو ان نیکیوں کا کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گستاخیاں کرنے والے کتنے ہی اچھے اعمال کیوں نہ کریں ان کی زندگی پر ان اچھے اعمال کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا۔ آخرت میں تو سوائے رسوائی اور عذاب کے ان کے لئے اور کچھ نہیں۔

☆ اس آیت مبارکہ سے چوتھی اہم بات یہ ثابت ہو گئی کہ بھولے سے بغیر قصد و ارادہ کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں آواز کا بلند ہونا کتنی معمولی سی بے ادبی ہے لیکن جب اتنی سی بے ادبی پر اتنی بڑی سزا کا قرآن اعلان کر رہا ہے کہ تمہارے سارے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ یعنی تم مرتد اور کافر ہو جاؤ گے تو پھر جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی بڑی گستاخیاں کرتے ہیں ان کا ایمان کب باقی رہے گا اور ان کی نیکیاں ان کے کیا کام آئیں گی۔ قرآن یہی تنبیہہ کرنا چاہتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے ادبی سے بچو ورنہ مرتد ہو جاؤ گے اور تمہارے سارے نیک اعمال برباد ہو جائیں گے۔

☆ ایک اور اہم بات یہ بھی ہے کہ انسان کو اگر اپنے کسی نقصان کا پتہ چل جائے تو وہ اس نقصان کی تلافی کی کوشش شروع کر دیتا ہے۔ مثلاً کسی کے یہاں زیور چوری ہو گیا تو اس کو

پتہ چل گیا کہ میرا زیور چوری ہو گیا ہے تو پھر وہ اس کی بازیابی کے لئے یا اس کے بدلہ دوسرا زیور بنانے کی کوشش کرتا ہے لیکن اگر کسی کو اس چوری کا پتہ ہی نہ چلے تو وہ آرام سے مطمئن بیٹھا رہے گا اور یہ سمجھتا رہے گا کہ میرے پاس تو اتنا زیور موجود ہے۔ لہٰذا اس کے حصول کی کوشش نہیں کرے گا۔ اسی طرح یہاں بھی اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ گستاخ مصطفیٰ کے سارے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور اس کی اس سے بڑی بدنصیبی کیا ہو گی کہ اس کو ان اعمال کے ضائع ہونے کا پتہ بھی نہیں چلے گا وہ اسی غلط فہمی میں رہے گا کہ میں بڑا نمازی حاجی پرہیز گار ہوں لیکن جب قیامت کے دن اسے پتہ چلے گا کہ یہ سب نیکیاں تو گستاخی رسول کے باعث ضائع ہو گئی تھیں تو اس وقت سوائے حسرت و یاس کے اس کے پاس اور کچھ نہ ہو گا۔ اگر پہلے سے پتہ چل جاتا تو شاید وہ اس کا تدارک کر لیتا لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم اس کو نقصان کی خبر ہی نہیں ہونے دیں گے، تاکہ وہ اسی غلط فہمی کا شکار رہے اور نیکیوں کو بچانے کا کوئی بندوبست بھی نہ کر سکے اور سیدھا جہنم میں چلا جائے۔ الغرض بتانا یہ مقصود ہے کہ حضور ﷺ کی ادنیٰ سی گستاخی انسان کے سارے اعمال ضائع کر کے اس کو سیدھا جہنم میں لے جاتی ہے اور اس جرم کی تلافی کی کوئی صورت ممکن نہیں۔

☆ علمائے کرام فرماتے ہیں کہ چونکہ حضور ﷺ آج بھی زندہ ہیں۔ لہٰذا اس آیت پر عمل آج بھی مسلمانوں پر ضروری ہے اور مسجد نبوی میں اور روضہ شریف کے پاس بلند آواز سے بات نہیں کرنی چاہئے۔ بلکہ جہاں حدیث کا درس ہو وہاں بھی بلند آواز سے بات نہیں کرنی چاہئے۔ کہ اس وقت روحانی طور پر حضور ﷺ کی صحبت اور رعیت حاصل ہوتی ہے۔

آیت نمبر (22)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا وَ اسْمَعُوْا ؕ وَ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۰۴﴾ (البقرہ)

"اے ایمان والو (میرے محبوب کو) "راعنا" مت کہو بلکہ "انظرنا" کہو اور ان کی بات پہلے ہی غور سے سنا کرو اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے"۔

فائدہ

اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ جب حضور ﷺ اپنے صحابہ کو وعظ ونصیحت فرماتے تھے اور ان میں سے کسی صحابی کو کوئی بات حضور ﷺ سے پوچھنے کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہ ان الفاظ میں حضور ﷺ سے درخواست کرتے تھے کہ ''راعنا'' یعنی یارسول اللہ ہماری رعایت فرمائیے اور اس بات کی وضاحت فرما دیجیے۔ یہودیوں کی لغت میں ''راعنا'' ایک برے معنی میں استعمال ہوتا تھا انہوں نے یہ لفظ بری نیت سے بولنا شروع کر دیا۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اور مسلمانوں کو ایسے لفظ کے بولنے سے ہی منع کر دیا جس میں حضور ﷺ کی بے ادبی کا کوئی شائبہ بھی ہوتا ہو اور صحابہ کو حکم دیا گیا کہ ''راعنا'' مت کہو بلکہ اس کے بجائے ''انظرنا'' کہو۔ جس کے معنی ہیں کہ یارسول اللہ ہم پر نظرِ کرم فرمائیے۔

اب یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ ''راعنا'' کے عربی میں کوئی غلط معنی نہیں اور نہ صحابہ کرام اس کو برے معنی میں استعمال کرتے تھے اور نہ ان کی اس لفظ سے کسی غلط معنی کی نیت ہوتی تھی۔ لیکن پھر بھی قرآن نے صحابہ کو ایسا لفظ استعمال کرنے سے ہی منع کر دیا جس سے کوئی دوسرا کسی دوسری لغت اور زبان میں کوئی غلط معنی نکال سکتا ہو۔ اس سے ثابت ہوا کہ حضور اکرم ﷺ کے لئے جہاں صراحتاً بے ادبی کے الفاظ استعمال کرنا منع ہیں وہاں ان کے لئے ایسے الفاظ کا استعمال بھی منع ہے جن سے دور کا بھی کوئی بے ادبی کا پہلو نکلتا ہو۔ اگرچہ وہ لفظ اچھے معنوں ہی میں کیوں نہ مستعمل ہوتا ہو اور استعمال کرنے والے کی نیت بھی گستاخی کی نہ ہو۔ پھر بھی اگر اس لفظ سے حضور ﷺ کی بے ادبی کا کوئی ہلکا سا شائبہ بھی ہو تو ایسا لفظ حضور کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں۔

بعض لوگ حضور ﷺ کی شان میں گستاخانہ عبارتیں لکھ کر پھر ان میں تاویلیں کرتے ہیں۔ اس کے اچھے معنی نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ ہماری نیت گستاخی کی نہیں تھی۔ ان سب کا رد قرآن کی اس آیت نے کر دیا کہ تمہاری نیت کو نہیں دیکھا جائے گا کہ ان الفاظ سے تمہاری مراد کیا تھی یا اس لفظ کے کوئی اچھے معنی ہیں یا نہیں۔ صرف یہ دیکھا

جائے گا کہ اس میں حضور ﷺ کی توہین اور بے ادبی کی کوئی ہلکی سی بو تو نہیں آرہی......؟ اگر ایسا ہوا تو اس کے لئے اس آیت نے بتادیا کہ وہ نبی کا گستاخ ہے اور کافر ہے اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے اور دنیا میں ایسے نبی کی گستاخی کرنے والوں کی کیا سزا ہے اس کے متعلق علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ جب یہ لوگ حضور ﷺ کی شان میں گفتگو کریں اور ان سے بے ادبی کی بو آئے تو سمجھ لو کہ یہی لوگ گستاخ ہیں اور ''مباح الدم'' ہیں اور ان کو قتل کرنا واجب ہے۔(الصارم المسلول ص 241) اسی لئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام نے اس آیت کے نازل ہونے کے بعد عہد کرلیا تھا کہ جس کسی کو حضور ﷺ کی شان اقدس میں گستاخی کا یہ کلمہ کہتے ہوئے سنیں گے تو اس کی گردن اڑا دیں گے۔(فتح القدیر جلد اول ص 125) بہر حال اس آیت سے ثابت ہوا کہ کوئی شخص حضور ﷺ کی شان میں بے ادبی اور گستاخی کے الفاظ استعمال کرتا ہے تو خواہ وہ گستاخی اس نے قصداً کی ہو یا بغیر قصداً کے، اس کی نیت اور ارادہ گستاخی کا ہو یا نہیں، ان الفاظ کے اچھے معنی ہوں یا نہیں، اگر اس میں حضور ﷺ کی اہانت اور توہین کا ہلکا سا شائبہ بھی ہوگا تو وہ شخص مرتد اور کافر ہو جائے گا اور اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہوگا کہ ایسے گستاخ کو فوراً قتل کی سزا دے۔

اس آیت میں ''واسمعوا'' فرما کے نبی کے ادب و احترام کی اہمیت کو مزید آشکارا کردیا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ میرے محبوب کی بارگاہ ہے اس میں ہوش کے ساتھ حضور کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو کے بیٹھا کرو اور حضور ﷺ کی بات کو غور سے سنا کرو کہ بار بار پوچھنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ کیونکہ یہ بھی میرے محبوب کی بارگاہ کے ادب کے خلاف ہے کہ تمہاری توجہ کسی اور طرف ہو اور تم حضور ﷺ کی بات غور سے نہ سنو اور تم کو حضور ﷺ سے ''انظرنا'' کہنے کی ضرورت پیش آئے۔ ہاں اگر غور سے سننے کے باوجود بھی ضرورت پیش آجائے تو اس وقت ''راعنا'' مت کہو کہ اس میں بھی بے ادبی کا پہلو نکلتا ہے بلکہ ''انظرنا'' کہو۔

☆ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ شعر نہیں پڑھنا چاہیے اس سے انسان مشرک ہو جاتا ہے شعر یہ ہے۔

یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اُنْظُرْ حَالَنَا
یَا حَبِیْبَ اللّٰہِ اِسْمَعْ قَالَنَا

جس کے معنی ہیں کہ یا رسول اللہ ہمارے حال پر نگاہ کرم فرمائیے اور یا حبیب اللہ ہماری فریاد کو سن لیجئے۔ جب کہ اس آیت میں خود اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو حکم دے رہا ہے کہ میرے محبوب کو ''انظرنا'' کہو۔ ظاہر ہے یہ آیت قیامت تک کے مسلمانوں کے لئے ہے تو ثابت ہوا کہ حضور ﷺ سے غلاموں کو اپنے حالات پر نگاہ کرم فرمانے کی درخواست کرنا شرک و بدعت نہیں بلکہ رب کے حکم پر عمل ہے اور اس شعر میں بھی چونکہ ''انظرنا'' کہہ کے حضور ﷺ سے گزارش کی جارہی ہے لہٰذا یہ بھی شرک نہیں بلکہ رب کے ارشاد پر عمل ہے۔

☆☆

آیت نمبر (23)

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (النساء)

''اے محبوب تیرے رب کی قسم یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے آپ کے جھگڑوں میں تمہیں حاکم نہ بنالیں، پھر جو تم فیصلہ فرمادو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ دل و جان سے اس کو تسلیم کرلیں''۔

فوائد

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ دو آدمی کسی معاملہ میں جھگڑ پڑے اور اپنا نزاع حضور ﷺ کی خدمت میں لے کر آئے۔ آپ نے شرعی لحاظ سے جس کا حق بنتا تھا اس کے حق میں فیصلہ صادر فرمادیا۔ جس کے خلاف فیصلہ ہوا اس نے کہا کہ چلو حضرت عمرؓ سے فیصلہ کراتے ہیں۔ یہ دونوں حضرت عمرؓ کی خدمت میں آئے اور ان سے فیصلہ کرانے کے

لئے کہا تو جس کے حق میں حضور ﷺ نے فیصلہ فرمایا تھا اس نے حضرت عمر سے عرض کیا کہ یہ بات میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ ابھی ہم حضور ﷺ کے پاس سے ہو کر آرہے ہیں اور حضور ﷺ میرے حق میں فیصلہ فرما چکے ہیں۔ لیکن یہ حضور ﷺ کے فیصلہ کو نہیں مان رہا اور مجھے آپ کے پاس لے کر آیا ہے کہ آپ سے فیصلہ کرائیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دوسرے سے پوچھا کیا واقعی ایسا ہی ہے جیسا کہ یہ شخص کہہ رہا ہے۔ اس نے کہا کہ ہاں یہ صحیح کہہ رہا ہے تو پھر آپ نے فرمایا ...... مکانکما حتی اخرج الیکما فاقضی بینکما فخرج الیهما مشتملا علی سیفه ضرب الذی قال ردنا الی عمر فقتله ...... یعنی آپ نے فرمایا کہ تم ابھی یہیں اپنی جگہ پر ٹھہرو میں ابھی تمہارے پاس آتا ہوں۔ تھوڑی دیر میں آپ اندر سے تلوار نکال کر لائے اور وہ شخص جس نے کہا تھا چلو عمر سے فیصلہ کراتے ہیں اس کو قتل کر دیا۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

(لباب النقول فی اسباب النزول، لجلال الدین سیوطی، ص 69 بحوالہ ابن مردویہ)

اس آیت سے ثابت ہوا کہ حضور ﷺ کا فیصلہ نہ مان کر جو اتنی سی بے ادبی بھی کرتا ہے اس کا فیصلہ عمر کی عدالت میں یہ ہے کہ اس کا سر قلم کر دیا جائے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن کی آیت نازل فرما کے عمر کے اس فیصلہ کی تصدیق فرما دی اور قرآنی مہر اس پر لگا دی کہ ایسا شخص حضور ﷺ کی بے ادبی کی وجہ سے مرتد ہو گیا اور عمر نے اس کو جو قتل کیا وہ بالکل درست ہے۔ اب ذرا غور فرمائیے جو اتنی سی بے ادبی پر اسلام سے نکل جاتا ہے اور اس کی سزا اسلام میں قتل ہے تو جو لوگ نبی کی بڑی بڑی گستاخیاں کرتے ہیں ان کا ایمان اور اسلام کب باقی رہ سکتا ہے ......؟ یقیناً ایسے لوگ اسلام سے بالکل نکل جاتے ہیں اور مرتد ہو کر اسلامی سزا کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

☆ اس آیت کا دوسرا حصہ ...... ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ ...... خاص طور پر قابل غور ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ میرا محبوب جو فیصلہ فرما دے صرف یہ نہیں کہ اس کو زبان سے مان لو بلکہ اگر تمہاری مرضی کے خلاف فیصلہ ہو تو دل میں بھی اس

فیصلہ سے کوئی تنگی محسوس نہ کرنا، حالانکہ شریعت میں دل کے وسوسوں اور خیالات پر کوئی پکڑ نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیئے ہیں۔ لیکن جب محبوب کی بارگاہ کے ادب واحترام کا معاملہ آتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہاں میں نے اپنا قانون بدل دیا۔ یہاں صرف تمہارا ظاہری طور پر تسلیم کرنا کافی نہیں بلکہ دل سے بھی اس کو ماننا ضروری ہے۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے محبوب کے ادب واحترام کی کتنی اہمیت ہے کہ دل میں بھی بے ادبی کا خیال لانا اس کو گوارا نہیں۔ اگر کوئی ظاہری طور پر حضور ﷺ کے فیصلہ کو مان لے لیکن دل سے نہ مان کر دل میں بے ادبی کا احساس رکھے وہ بھی اس آیت کی رو سے اسلام سے نکل جاتا ہے۔ اب غور فرمائیں کہ جو لوگ زبان سے نبی کی گستاخیاں کرتے ہیں بھلا رب کو وہ کب گوارا ہو سکتی ہیں۔ جب محبوب کی گستاخی کا خیال لانا بھی اس کو گوارا نہیں تو گستاخی کا زبان یا بدن کے عوض سے اس کا مظاہرہ رب کو کب گوارا ہو سکتا ہے اور ایسا شخص کب مسلمان رہ سکتا ہے۔

آیت نمبر (24)

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ﴿٥٨﴾ (توبہ)

"اور ان میں سے بعض ایسے ہیں جو آپ پر خیرات کے بانٹنے میں نکتہ چینی کرتے ہیں، پس اگر ان کو اس مال غنیمت میں سے کچھ مل جائے تو خوش ہو جاتے ہیں اور اگر اس میں سے کچھ نہ ملے تو ناراض ہو جاتے ہیں"۔

فائدہ

یہ آیہ کریمہ ایک منافق حرقوص بن زہیر جس کا لقب ذوالخویصرہ تھا اس کے بارے میں نازل ہوئی اور اس کا تفصیلی واقعہ بخاری ومسلم میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ فتح حنین کے موقع پر حضور ﷺ نے مال غنیمت تقسیم فرمایا تو اس منافق ذالخویصرہ نے بڑے گستاخانہ لہجہ میں حضور ﷺ سے کہا یا رسول اللہ انصاف کیجئے۔ آپ نے فرمایا تیری خرابی ہو اگر میں نے

انصاف نہ کیا تو اور کون انصاف کرے گا......! حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یارسول الله ائذن لی فیه اضرب عنقه یارسول الله مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس کی گردن اڑادوں۔ آپ نے فرمایا عمر رہنے دو، اس کے ساتھی ایسے ہوں گے کہ تم میں سے ہر ایک اپنی نماز کو ان کی نمازوں کے آگے حقیر جانے گا، اپنے روزے ان کے روزوں کے آگے حقیر جانے گا، وہ قرآن پڑھیں گے لیکن قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا، وہ دین سے ایسے نکل جائیں گے جس طرح تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔ (صحیح بخاری کتاب المناقب ص 509)

☆ اس آیت مبارکہ اور اس کے شان نزول سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کی جودو عطاء، علم، حلم، طاقت و قدرت الغرض آپ کی کسی بھی صفت اور شان پر اعتراض کرنا یہ منافقوں کا کام ہے۔ جیسا کہ اس منافق نے حضور ﷺ کی عطاء و بخشش پر اعتراض کیا۔ سچا مومن حضور ﷺ کی کسی بھی صفت پر نہ کبھی کوئی اعتراض کرے گا اور نہ اس میں کوئی خامی اور کمی تلاش کرے گا اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو سمجھ لو کہ وہ منافق ہے اور اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں، وہ جہنمی ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جہنم اس کا مقدر ہے۔

☆ دوسری اہم بات یہ پتہ چلی کہ قیامت تک آنے والے ان نبی کے گستاخ منافقوں کی نشانی حضور ﷺ نے بیان فرما دی۔ آج ہم ان نشانیوں کے ذریعہ ایسے گستاخ منافقوں کو بڑی آسانی سے پہچان سکتے ہیں۔ حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق ان کی نشانی یہ ہے کہ اتنی اچھی نمازیں پڑھیں گے اور اتنے اچھے روزے رکھیں گے کہ ان کی نمازوں اور روزوں کے آگے عام مسلمان اپنی نمازوں اور روزوں کو حقیر سمجھے گا اور اپنی عبادتوں سے شرمائے گا۔ وہ قرآن کی تلاوت بھی خوب کریں گے لیکن قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔ لہٰذا آج بھی اگر کوئی نماز اور روزوں پر بہت زور دے ہر وقت اس کی تبلیغ کرے بہت عمدہ لمبی لمبی نمازیں پڑھے لیکن ساتھ میں اپنی کتابوں، تحریروں اور تقریروں اور نجی محفلوں میں حضور ﷺ کی توہین اور گستاخی کرے تو سمجھ لو کہ یہ پکا منافق اور جہنمی ہے اور اسی ذوالخویصرہ کی نسل سے ہے۔

☆ تیسری سب سے اہم بات یہ ثابت ہوئی کہ ہر نمازی حاجی اور قاری مسلمان نہیں ہوتا بلکہ حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق بہت سے ایسے بھی ہیں جو بہت اچھے قاری ہوں گے بڑے پکے نمازی ہوں گے لیکن گستاخ رسول کے باعث وہ اسلام سے ایسے نکل گئے ہوں گے جیسے تیر شکار سے نکل جاتا ہے۔ یعنی جب تیر شکار کو چیرتا ہوا نکلتا ہے تو اس تیر پر اس کے شکار کے خون وغیرہ کے کوئی آثار کوئی نشانی تک موجود نہیں ہوتی۔ اسی طرح حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ گستاخ نماز اور روزوں کے باوجود اسلام سے ایسے نکل جائیں گے کہ اسلام کا ذرہ برابر اثر ان کے دل میں موجود نہیں ہوگا۔ یعنی جہنمی ہوں گے اور ان کا نماز روزہ سب بیکار جائے گا۔ لہٰذا ایسے لوگوں کی لمبی لمبی نمازوں اور روزوں سے دھوکہ میں آ کر ان کو مسلمان نہیں سمجھنا چاہئے اور نہ مسلمانوں جیسا ان کے ساتھ برتاؤ کرنا چاہئے بلکہ ایسے نبی کے گستاخوں سے دور رہنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ گستاخی رسول کے باعث اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی جو لعنت ان پر برس رہی ہے اس کا جو عتاب ان پر نازل ہو رہا ہے اس کی لپیٹ میں ان کے ساتھ بیٹھنے والا بھی آئے۔ کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے...... المرء مع من احب...... کہ دنیا میں تمہیں جس کے ساتھ محبت اور دوستی ہو گی قیامت کے دن ان ہی کے ساتھ ہوں گے۔ لہٰذا ایسوں کی دوستی سے بھی بچو۔

آیت نمبر (25)

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ﴿۶۴﴾ (النساء)

"اور اگر وہ کبھی اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھے تھے تو (اے محبوب) تمہارے حضور حاضر ہو جاتے اور پھر اللہ سے مغفرت طلب کرتے اور رسول بھی ان کے لئے مغفرت طلب کرتا تو ضرور اللہ تعالیٰ کو بہت توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا پاتے"۔

فوائد

اس آیت مبارکہ سے کئی اہم فائدے اور سبق ہمیں حاصل ہوئے۔ پہلا فائدہ تو یہ حاصل ہوا کہ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہمارے شفیع اور سفارشی ہیں اور ان کی شفاعت اور سفارش کے بغیر بگڑی نہیں بنے گی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے صاف فرما دیا کہ اگر اپنے گناہوں کو معاف کروانا چاہتے ہو تو نبی کے پاس آؤ اور وہ بھی تمہاری سفارش کریں تب تمہارے گناہ معاف کروں گا۔ معلوم ہوا کہ گناہوں کی بخشش اور اللہ تعالیٰ کی رحمت حضور کی سفارش اور شفاعت کے بغیر نہیں مل سکتی۔ جب کہ حضور ﷺ کی سفارش اور شفاعت سے گناہ گاروں کی مشکلیں آسان ہو جائیں گی اور ان کے بیڑے پار ہو جائیں گے۔ بعض لوگ حضور ﷺ کی شفاعت کا انکار کرتے ہیں اور دلیل کے طور پر یہ آیت پیش کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ قیامت کے دن نہ خرید و فروخت ہوگی نہ دوستی نہ شفاعت اور سفارش (بقرہ ص 254) لہٰذا ثابت ہوا کہ حضور ﷺ کی شفاعت بھی کام نہیں آئے گی۔ (معاذ اللہ)

اس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کی آیات جن میں شفاعت کی نفی کی گئی ہے اس سے مراد کفار کی شفاعت، بتوں کی شفاعت یا جبراً شفاعت مراد ہے کہ اس قسم کی وہاں شفاعت کوئی کام نہیں آئے گی۔ جب کہ حضور ﷺ کی اور آپ کے پیارے اولیاء کی شفاعت ضرور ہوگی اور گناہ گاروں کے کام آئے گی۔ چنانچہ خود قرآن میں دوسرے مقام پر فرمایا گیا ...... لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِیَ لَهٗ قَوْلًا ...... کہ شفاعت نفع نہ دے گی مگر ان کو جن کے لئے رب نے اجازت دی اور اس کے کلام سے رب راضی ہوا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی اجازت سے شفاعت کریں گے اور پھر مندرجہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ گناہ گاروں کو خود حکم دے رہا ہے کہ میرے محبوب کی سفارش لے کر آؤ اگر حضور ﷺ کی شفاعت قابل قبول نہ ہوتی تو ان کی سفارش کروانے اور شفاعت لانے کا کیوں حکم دیتا۔
معلوم ہوا کہ انبیاء اولیاء کی شفاعت برحق ہے اور جو لوگ حضور ﷺ کی شفاعت کے قائل

نہیں وہ مندرجہ بالا آیت کی رو سے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہیں۔

☆ دنیا کا دستور تو یہ ہے کہ آدمی جس کی خطا کرے معافی کے لئے اسی کے در پر لایا جاتا ہے۔ لیکن یہاں معاملہ عجیب ہے۔ گناہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے کئے، نماز اس کی نہیں پڑھی، روزہ اس کا نہیں رکھا، حج اس کا نہیں کیا لیکن معافی کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ میرے پاس آؤ بلکہ فرمایا میرے محبوب کے پاس جاؤ۔ درحقیقت اس میں دو باتوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ ایک تو یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ میرا اور میرے محبوب کا معاملہ علیحدہ علیحدہ نہیں۔ ان کی بیعت میری بیعت ہے، ان کا پھینکنا میرا پھینکنا ہے، ان کی رضا میری رضا ہے، ان کا ہاتھ میرا ہاتھ ہے لہٰذا ان کا در میرا در ہے جو یہاں آ گیا وہ میرے پاس آ گیا۔

بخدا خدا کا یہی ہے در، نہیں اور کوئی مفر مقر
جو وہاں سے ہو یہیں آ کے ہو، جو یہاں نہیں تو وہاں نہیں

اور دوسری یہ بات واضح کرنی مقصود ہے کہ "بلا واسطہ" میرے پاس آنے کا خیال اپنے دل سے نکال دو۔ میرے محبوب کے وسیلہ اور توسل سے جو میرے پاس آئے گا وہ میرا محبوب ہے۔ اسی لئے ان کے پاس بھیجا جا رہا ہے کہ ان کا وسیلہ لے کر آؤ۔ اگر بغیر ان کے وسیلہ کے "ڈائریکٹ" آئے تو ذلیل و رسوا ہو گے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت و عنایت سے محروم ہو جاؤ گے۔

وہ کہ جو اس در کا ہوا خلق خدا اس کی ہوئی
وہ کہ جو اس در سے پھرا اللہ اس سے پھر گیا

بعض لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ پکڑنے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے توسل کرنے کو شرک کہتے ہیں۔ حالانکہ اگر یہ شرک ہوتا تو اس آیت میں اللہ تعالیٰ ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ لانے کے لئے کیوں بھیجتا۔ جب کہ دوسری آیت میں اور واضح طریقہ سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ لانے کا حکم دیا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے...... وَابْتَغُوْٓا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ...... کہ اللہ تعالیٰ کی طرف وسیلہ ڈھونڈو۔ اس آیت میں ایمان اور اعمال کا

پہلے ذکر آ گیا لہٰذا وسیلہ سے ایمان اور اعمال تو مراد ہوں گے ہی نہیں۔ بلکہ یقیناً اس سے مراد حضور ﷺ کی ذات گرامی ہوگی کہ آپ کا وسیلہ لے کر آؤ۔ خود ہمارے باپ حضرت آدم علیہ السلام نے حضور ﷺ کا وسیلہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کیا تو ان کی توبہ قبول ہو گئی۔ (طبرانی 82/20- مستدرک 615/2- ابن عساکر 257/2- زرقانی ص 62- مواہب اللدنیہ ص 12- خصائص کبریٰ ص 17) قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے......

وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا...... کہ یہودی حضور ﷺ کی تشریف آوری سے قبل حضور ﷺ کا وسیلہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کر کے دعا کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ کافروں پر ان کو فتح عطا فرما دیا کرتا تھا۔ بلکہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب قحط پڑا تو انہوں نے حضور ﷺ کے چچا حضرت عباس سے توسل کیا اور ان کا وسیلہ اللہ تعالیٰ کی جناب میں وسیلہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اے اللہ ہم حضور ﷺ کا وسیلہ تیری بارگاہ میں پیش کرتے تھے تو تو بارشیں برسا دیا کرتا تھا آج ہم تیرے نبی کے چچا کا وسیلہ تیری بارگاہ میں پیش کرتے ہیں ہمیں بارش عطاء کر دے اور قحط سالی دور فرما تو اللہ تعالیٰ نے فوراً اس وسیلہ کو قبول فرمایا اور بارش برسنی شروع ہو گئی۔ (بخاری) معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے پیاروں کا وسیلہ پکڑنا یہ نبیوں اور ولیوں اور صحابہ کا طریقہ رہا ہے اور اس کے سبب سے اللہ تعالیٰ مشکلیں آسان فرماتا رہا ہے اور اپنی رحمتوں سے نوازتا رہا ہے اور ہمیشہ نوازتا رہے گا۔ لہٰذا آج بھی جو حضور ﷺ کا وسیلہ پکڑے گا وہ کامیاب اور بامراد ہے اور جو بغیر وسیلہ کے اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کی کوشش کرے گا وہ اس آیت کی رو سے ناکام و نامراد ہے۔

اس آیت مبارکہ میں زمانہ کی کوئی قید نہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ قیامت تک کوئی بھی شخص گناہ کرے اس کے لئے یہ حکم ہے کہ حضور ﷺ کے پاس آئے اور حضور ﷺ سے سفارش کرائے۔ اب جیسا کہ بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ حضور کچھ سنتے نہیں، انہیں کچھ علم نہیں، وہ کوئی نفع و نقصان نہیں پہنچا سکتے تو سوال یہ ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے پاس ہمیں کیوں بھیجا......؟ جب اللہ تعالیٰ نے گناہ گاروں کو حضور ﷺ کے پاس بھیجا ہے

اور حضور ﷺ کی سفارش کرانے کو کہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضور ﷺ کا امتی جہاں بھی ہو اور جس زمانہ میں بھی ہو حضور ﷺ اس کے احوال کو دیکھ بھی رہے ہیں۔ آپ کو اس کے حالات کی خبر بھی ہے۔ آپ اس کی فریاد کو سنتے بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کی سفارش اور شفاعت کر کے اس کی مشکلیں بھی آسان فرما دیتے ہیں۔ جب وہ گناہ جیسی مشکل آسان کر دیتے ہیں تو دنیا کی اور کوئی چھوٹی موٹی مشکل ان کے سامنے کیا حیثیت رکھتی ہے......؟ وہ فریاد کرنے والے کی ہر مشکل آسان کرا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضورِ ﷺ کے وصال کے تین روز بعد ایک اعرابی آیا اور حضور ﷺ کی قبر انور پر فرطِ غم سے نڈھال ہو کر گر پڑا اور یہ آیت مبارکہ تلاوت کر کے حضور ﷺ سے اپنے گناہوں کی سفارش کے لئے عرض کیا تو قبر انور سے آواز آئی کہ جا تجھے بخش دیا گیا (قرطبی) معلوم ہوا کہ وصال کے بعد بھی آپ امت کی فریاد کو سنتے ہیں، دیکھتے ہیں اور ان کی مشکلیں آسان فرماتے ہیں۔

☆ اس آیت میں جگہ کی کوئی قید نہیں لہٰذا آیت کے معنی یہ ہوئے کہ دنیا کے کسی کونے اور گوشہ میں کوئی رہنے والا ہو وہ اگر گناہ کرے تو اپنے گناہوں کو بخشوانے کے لئے حضور ﷺ کے پاس آئے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کے گناہ گار امتی سارے جہان میں پھیلے ہوئے ہیں اور بہت سے اتنے غریب ہیں کہ وہ مدینہ نہیں پہنچ سکتے تو ان کے گناہ پھر کیسے معاف ہوں گے......؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ مدینہ میں حاضر ہو جاؤ بلکہ فرمایا کہ میرے محبوب کے پاس آ جاؤ یعنی ان کی طرف متوجہ ہو کر روحانی طور پر ان کی بارگاہ میں حاضر ہو جاؤ اور پھر ان سے فریاد کرو۔ تم دنیا کے جس کونہ میں اور گوشہ سے ان کو پکارو گے وہ تمہاری فریاد کو سن بھی لیں گے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تمہاری سفارش کر کے تمہارا بیڑا پار لگا دیں گے۔ وہ تو تمہارے قریب ہیں...... اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ...... کہ نبی مومنوں سے ان کی جانوں سے زیادہ قریب ہے۔ (الاحزاب:6) لہٰذا جہاں ہو وہیں سے عرض کر دو وہ تمہاری فریاد کو سن کر وہیں سے تمہاری سفارش کر دیں گے اور تمہاری بخشش کا سامان ہو جائے گا۔

آیت نمبر (26)

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَ اٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾ (بقرہ)

"اور ان سے ان کے نبی نے فرمایا (حضرت شموئیل علیہ السلام) کہ اس کی بادشاہت کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق آجائے جس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے دلوں کا چین ہے اور حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیہما السلام) کی کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں جو انہوں نے چھوڑی ہیں، اٹھائے ہوئے ہوں گے اسے فرشتے، بے شک اس میں تمہارے لئے نشانی ہے اگر تم مومن ہو"۔

فوائد

اس آیت مبارکہ میں جس صندوق کا ذکر ہو رہا ہے یہ شمشاد کی لکڑی کا بنا ہوا صندوق تھا۔ جس میں انبیائے کرام کے کچھ تبرکات تھے۔ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور ان کی جوتیاں اور حضرت ہارون علیہ السلام کا عمامہ، حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی، توریت کی تختیوں کے چند ٹکڑے اور کچھ من وسلویٰ وغیرہ تھے۔ بنی اسرائیل جب کافروں سے جہاد کے لئے جاتے اور دشمنوں کے عظیم لشکر کو دیکھ کر ڈر جاتے تو اس صندوق کو اپنے آگے رکھ لیا کرتے تھے۔ جس سے ان کے دلوں میں سکون وطمانیت پیدا ہو جاتی تھی اور اس کے صدقہ میں اللہ تعالیٰ کافروں پر ان کو فتح ونصرت عطا فرما دیتا تھا۔ اگر اس کے وسیلہ سے وہ دعا کرتے تھے تو ان کی مشکلیں آسان ہو جاتی تھیں، بلائیں دور ہو جاتی تھیں اور مرادیں ان کی پوری ہو جاتی تھیں۔ مگر جب بنی اسرائیل کے گناہ اور سرکشی بڑھی تو قوم عمالقہ اللہ تعالیٰ نے ان پر مسلط کر دی۔ جس نے بنی اسرائیل کا قتل عام کر کے ان کو تباہ و برباد کر دیا اور ان سے یہ صندوق بھی اٹھا کر لے گئے اور ان عمالقہ کے کافروں نے اس صندوق کو ایک کوڑے کے ڈھیر پر لے جا کے

ڈال دیا۔ اس صندوق کی بے ادبی سے اس قوم عمالقہ پر طرح طرح کی مصیبتیں اور بیماریاں نازل ہوئیں۔ جس سے وہ تباہ و برباد ہو گئے اور انہیں یقین ہو گیا کہ یہ اس صندوق کی بے ادبی کی وجہ سے ہم پر مصیبتیں نازل ہوئی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اس صندوق کو ایک بیل گاڑی پر رکھ کر بنی اسرائیل کی طرف ہانک دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے چار فرشتوں کو بھیجا جو بڑی تعظیم کے ساتھ اس صندوق کو بنی اسرائیل کے اس وقت کے نبی حضرت شموئیل علیہ السلام کے پاس لے کر آئے۔ جس کو دیکھ کر بنی اسرائیل نے طالوت کی بادشاہی کو تسلیم کر لیا۔ کیوں کہ طالوت کی بادشاہی کو ماننے کے لئے یہی شرط رکھی تھی کہ وہ متبرک صندوق دوبارہ ہمارے پاس آ جائے۔ اس قرآنی واقعہ سے بہت سے فوائد ہمیں حاصل ہوئے۔

☆ پہلا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ کے پیاروں سے نسبت ہو جائے وہ تبرکات بڑے برکت والے اور بڑے عزت و عظمت والے ہو جاتے ہیں۔ دیکھئے وہ صندوق جس میں انبیاء علیہم السلام کے تبرکات تھے۔ ان کا کتنا بڑا مرتبہ ہو گیا کہ قرآن کہتا ہے...... تحمله الملائكه...... کہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرشتے مقرر فرمائے جنہوں نے اپنے نورانی کندھوں پر اٹھا کے اس کو حضرت شموئیل علیہ السلام تک پہنچایا۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے پیاروں کے تبرکات بڑے لائق تعظیم و تکریم ہوتے ہیں۔ لہٰذا جو لوگ مکہ اور مدینہ میں اپنے نبی سے نسبت رکھنے والے ستونوں، در و دیواروں، پہاڑ کے پتھروں، درخت کے پتوں اور خاک کے ذروں کو چومتے ہیں اور اس کا ادب کرتے ہیں وہ درحقیقت اس آیت پر عمل کر رہے ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس آیت میں یہی سبق دیا گیا ہے کہ ان تبرکات کا احترام اور تعظیم کرنا شرک نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے...... ان كنتم مومنين...... کہ یہ تمہارے ایمان کی نشانی ہے۔ اگر تم مؤمن ہو تو اس کی عظمت کو سمجھ کر اس کی تعظیم کرو گے۔ دوسرے مقام پر قرآن میں صفا اور مروہ وہ دو پہاڑیاں جن پر اللہ تعالیٰ کی ایک پیاری ولیہ حضرت ہاجرہ کے قدم لگے تھے ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانی فرمایا اور اپنی نشانیوں کی تعظیم کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴿۳۲﴾ کہ

ہماری نشانیوں کی تعظیم شرک نہیں بلکہ دلوں کے تقوے کی علامت ہے۔(سورہ حج) اسی لئے صحابہ کرام حضور ﷺ کے تبرکات کا بڑا ادب واحترام کرتے تھے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جب حضور ﷺ حجامت بنواتے تھے تو صحابہ کرام آپ کے اردگرد کھڑے ہو جاتے تھے اور آپ کا کوئی بال زمین پر نہیں گرنے دیتے تھے۔ بلکہ اس کو ہاتھوں میں اٹھا لیا کرتے تھے (مسند احمد 127/3- مسلم شریف 252/2) اور اس کو خوشبوؤں میں بسا کر بڑے ادب سے اپنے پاس رکھا کرتے تھے۔(بخاری ص 502) حضور ﷺ کے وضو کا پانی جب بلال لاتے تو لوگ اس تبرک کو لینے کے لئے ٹوٹ پڑتے تھے۔ جس کو یہ پانی مل جاتا وہ اس کو اپنے ہاتھ سے چہرے پر مل لیا کرتا تھا اور جس کو نہ ملتا وہ اپنے ساتھی کے ہاتھ سے کچھ تری حاصل کر کے برکت حاصل کر لیا کرتا تھا۔(بخاری ص 503) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور ﷺ کا وہ کمبل مبارک جس میں آپ کا وصال ہوا تھا اپنے پاس بڑی احتیاط سے سنبھال کر رکھا ہوا تھا (بخاری ص 438) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور ﷺ کی نعلین مبارک کو بڑے ادب سے رکھا ہوا تھا اور وہ ان کی زیارت کراتے تھے۔ (بخاری ص 438/871) حضرت کبشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے یہاں ایک روز حضور ﷺ نے ان کے مشکیزہ سے منہ لگا کر پانی نوش فرمالیا تو انہوں نے مشکیزہ کا وہ حصہ جہاں مصطفیٰ ﷺ کے لبہائے مبارک لگے تھے وہ بطور تبرک کاٹ کر اپنے پاس رکھ لیا (ترمذی 2،ص 11) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور ﷺ کے ممبر پر ہاتھ پھیر کے ان ہاتھوں کو اپنے چہرہ پر مل لیا کرتے تھے۔(شفاء لقاضی عیاض 24/2) حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے وصیت کی تھی کہ میرے پاس حضور ﷺ کے کچھ ناخن اور بال اور ایک کرتہ موجود ہے جب میرا انتقال ہو جائے تو اس کرتہ کو میرے کفن کے اندر اس طرح رکھنا کہ میرے جسم سے وہ مس ہو جائے اور حضور ﷺ کے بالوں اور ناخنوں کو میرے منہ، آنکھوں اور مواضع سجود پر رکھ دینا کہا اگر اس وقت کوئی چیز میرے کام آئے گی تو یہی چیزیں ہیں۔(الاستیعاب لابن عبدالبر علی ہامش الاصابہ جلد 3 ص 399) بہر حال ان آیات

اوراحادیث سے ثابت ہوا کہ تبرکات کی تعظیم کرنا، ان کا احترام کرنا، ان سے برکتیں حاصل کرنا، ان کو ادب سے بحفاظت رکھنا اور ان کو اپنی قبر میں رکھنے کی وصیت کرنا یہ سب امور شرک و بدعت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کی سنت ہیں اور رب کی رحمت و مغفرت کے نزول کا باعث ہیں۔

☆ تیسری اہم بات اس آیت سے یہ ثابت ہوئی کہ انبیاء اور اولیاء کے تبرکات نافع بھی ہیں، دافع بھی ہیں اور مشکل کشا بھی ہیں۔ دیکھئے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا...... فیه سکینة...... کہ اس صندوق میں دلوں کا چین ہے یعنی اس تبرکات والے صندوق سے دلوں کو طمانیت اور سکون ملتا ہے۔ پھر بنی اسرائیل اس سے نہ صرف جہاد میں طمانیت اور سکون حاصل کرتے تھے بلکہ اس کے صدقہ سے بڑی بڑی مشکلات حل کر لیا کرتے تھے۔ اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے پیاروں کے تبرکات میں یہ تاثیر ہے کہ اس سے مشکلیں آسان ہوتی ہیں اور مرادیں پوری ہوتی ہیں۔ اسی لئے قرآن میں آتا ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کا کرتہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھوں پر ڈالا گیا تو ان کی بینائی واپس آ گئی (یوسف:96) حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ کا جبہ مبارک حضرت عائشہؓ سے میں نے حاصل کر لیا تھا اور اسے دھو کر بیماروں کو پلاتے تھے تو ان کو شفاء مل جاتی تھی۔ (مسلم 190/2- مشکوٰۃ ص 372) حضرت ام سلمہ کے پاس ایک چاندی کی ڈبیہ تھی جس میں سرکار دو عالم ﷺ کے چند موئے مبارک تھے اور جب کسی کو نظر لگ جاتی تھی یا کوئی بیمار ہوتا تھا تو وہ پانی کا برتن آپ کے پاس بھیج دیا کرتا تھا آپ اس میں وہ ڈبیہ ڈبو دیا کرتی تھیں اور اس پانی کو جب بیمار پیتا تھا تو اس کو شفاء ملتی چلی جاتی تھی۔ (بخاری 875/2) حضرت خالد بن ولیدؓ نے اپنی ٹوپی میں حضور ﷺ کے بال مبارک سیئے ہوئے تھے جن کی برکت سے ان کو ہر جنگ میں فتح و نصرت ملتی تھی۔ (عمدۃ القاری شرح بخاری 37/3) ثابت ہوا کہ تبرکات سے مشکلیں آسان ہوتی ہیں، بیماریاں اور بلائیں رد ہوتی ہیں اور مرادیں برآتی ہیں۔ جب ان اللہ تعالیٰ کے پیاروں کے تبرکات

کی یہ تاثیر ہے تو خود اللہ تعالیٰ کے پیارے کیوں نہ مشکل کشا اور دافع بلاء ہوں گے......؟

☆ چوتھی اہم بات اس آیت سے یہ ثابت ہوئی کہ جب اللہ تعالیٰ کے پیاروں کے جسم سے لگنے والے تبرکات میں یہ برکتیں اور تاثیریں ہیں تو پھر جس قبر میں خود اللہ کے پیارے کا جسم موجود ہوگا وہاں کیوں نہ اللہ تعالیٰ کی برکتیں اور رحمتیں نازل ہوں گی اور اس قبر کے صدقہ میں کیوں نہ مشکلیں آسان ہوں گی اور کیوں نہ مرادیں پوری ہوں گی۔ اسی لئے حضور ﷺ کے وصال کے بعد جب مدینہ میں شدید قحط پڑا اور لوگوں نے حضرت عائشہؓ سے عرض کیا تو آپ نے فرمایا کہ روضہ شریف کی چھت میں ایک سوراخ اس طرح کردو کہ حضور ﷺ کی قبر انور اور آسمان کے درمیان کوئی چیز حائل نہ رہے۔ جب لوگوں نے ایسا کیا تو بارش اسی وقت برسنی شروع ہوگئی اور اتنی برسی کہ اس سال کا نام ''عام فتق'' ہوگیا کہ اونٹوں کے جسم کھا کھا کر چربی سے پھٹنے لگے (سنن دارمی 43/1) اسی طرح حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں جب مجھے کوئی مشکل پیش آتی ہے تو میں حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مزار پر حاضر ہو کے دو رکعت نماز پڑھ کے ان کی قبر کے پاس اللہ تعالیٰ سے سوال کرتا ہوں اسی وقت میری مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ (فتاویٰ شامی 41/1)

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو جب قبر میں رکھا تو ان کی قبر سے مشک کی خوشبو آنے لگی۔ لوگ بطور تبرک آپ کے مزار کی مٹی کو لے جانے لگے یہاں تک کہ آپ کی قبر کے اردگرد ایک لکڑی کا جال بنا دیا گیا تا کہ لوگوں سے قبر محفوظ رہے۔ پھر جب سمرقند میں قحط پڑا تو قاضی شہر سب لوگوں کو لے کر آپ کی قبر پر گیا اور آپ کی قبر کے وسیلہ سے دعا کی تو اس زور کی بارش ہوئی کہ سات روز تک مسلسل ہوتی رہی (تیسیر الباری شرح بخاری 22/1)

بہر حال ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے پیاروں کے مزارات پر حاضری دینا اور ان کے مزارات کے وسیلہ سے دعائیں کرنا قبولیت دعا اور رحمت خداوندی کا موجب ہوتا ہے۔

☆ پانچویں بات اس آیت مبارکہ سے یہ ثابت ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کے پیاروں کے تبرکات کی بے ادبی اور توہین کرنا اللہ تعالیٰ کے غضب اور اس کی ناراضگی کا باعث

ہوتا ہے۔ دیکھئے قوم عمالقہ نے جب اس تبرکات والے صندوق کو کوڑے کے ڈھیر پر پھینکا تو وہ تباہ و برباد ہو گئے۔ لہٰذا بزرگوں کے تبرکات اور ان کی قبروں کی بے ادبی اور گستاخی سے بچنا چاہیے کہیں اس گستاخی اور بے ادبی کے سبب خدا کے قہر اور عذاب سے دو چار نہ ہو جائیں۔

☆☆

آیت نمبر (27)

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝۵۸

”اے حبیب آپ فرما دیجئے کہ اللہ کا وہ فضل جو ان پر ہوا اور اللہ کی رحمت جو انہیں عطا کی گئی اس کے سبب وہ خوشیاں منائیں یہ اس سے بہتر ہے جسے وہ جمع کرتے ہیں“۔ (یونس)

فائدہ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو حکم دے رہا ہے کہ ”اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت“ کے ملنے پر خوشیاں مناؤ۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کے فضل اور رحمت سے یہاں کیا مراد ہے......؟ تو آیئے قرآن حکیم سے ہی پوچھتے ہیں۔ ارشاد رب العزت ہے فَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۶۴ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس آیت میں فضل اور رحمت سے حضور ﷺ کی ذات گرامی مراد ہے اور اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ اگر حضور ﷺ کی صورت میں میں تم پر اپنا فضل اور رحمت نہ کرتا تو تم تباہ و برباد ہو جاتے۔ دوسرے مقام پر اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ خود حضور ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝۱۰۷ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی سب سے بڑی رحمت حضور ﷺ کی ذات گرامی ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے ”رحمت للعالمین“ بنا کر بھیجا ہے۔ لہٰذا اب مندرجہ بالا آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو حکم دے رہا ہے کہ جو سب سے بڑی رحمت ہے یعنی رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ کی ذات گرامی، ان کی

آمد اور ان کے میلاد پر خوب خوشیاں مناؤ اور اس پر خوب فرحت و مسرت کا اظہار کرو۔

☆ اس آیت میں "فضل اور رحمت" دو چیزوں کا ذکر کیا لیکن ان کے لئے ضمیر اس کے بعد "ذالک" کی واحد لائی گئی۔ حالانکہ دو چیزوں کے لئے عربی میں ضمیر تثنیہ کی آتی ہے۔ لیکن یہاں واحد کی ضمیر لا کر اشارہ کر دیا کہ میرا فضل اور میری رحمت سے یہاں دو علیحدہ علیحدہ چیزیں مراد نہیں بلکہ ایک ذات مصطفیٰ مراد ہے جو میرا عظیم فضل بھی ہے اور میری سب سے بڑی رحمت بھی ہے۔ لہٰذا اسی ایک ذات کی آمد پر خوشیاں منانے کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر خوش ہونے اور اس کا شکر ادا کرنے کے کئی طریقے ہیں۔ نماز پڑھ کر بھی، روزہ رکھ کر بھی اور دیگر عبادت کر کے بھی، صدقہ و خیرات کر کے بھی۔ الغرض مختلف طریقوں سے اظہار مسرت کر کے اس کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں کسی خاص چیز کا اس آیت میں ذکر نہیں فرمایا گیا۔ اگر یہ کہہ دیا جاتا کہ نماز شکرانہ ادا کر کے فرحت کا اظہار کرو اور میرا شکریہ ادا کرو تو میلاد شریف پر صرف نماز پڑھ کے اظہار مسرت کرنے والا قرآن پر عمل کرنے والا ہوتا لیکن دوسرے انداز سے مسرت اور فرحت کا اظہار پھر مشروع نہ بنتا۔ لیکن رب کائنات نے فلیفرحوا...... کا عام لفظ لا کر بتا دیا کہ تم خوشی اور فرحت کے مواقع پر جس انداز سے جس اپنے ملک اور تہذیب و تمدن کے مطابق خوشیاں مناتے ہو۔ میرے محبوب کی آمد پر بھی اسی طرح اور اسی انداز سے خوب فرحت اور مسرت کا اظہار کر کے میری اس عظیم نعمت پر میرا شکریہ ادا کرنا۔ لہٰذا اب جو کوئی میلاد شریف کے موقع پر روزہ رکھتا ہے کوئی نمازیں پڑھتا ہے کوئی انواع و اقسام کے کھانوں کی دیگیں پکاتا ہے کوئی اپنے گھر کو سجاتا ہے، کوئی قمقمے لگاتا ہے، کوئی بجلیاں جلاتا ہے، کوئی چراغاں کرتا ہے۔ الغرض حضور ﷺ کا غلام جس انداز سے خوشی مناتا ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عمل کر کے اس کا شکریہ ادا کر رہا ہوتا ہے۔ بہرحال ثابت ہو گیا کہ ہر وہ خوشی جس کی اسلام میں ممانعت نہیں آئی، میلاد شریف کے موقع پر اس خوشی کا منانا نہ شرک ہے نہ بدعت۔ بلکہ

قرآن پر عمل کر کے اللہ تعالیٰ کا محبوب بننے کا طریقہ ہے۔

☆ اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے کئی تاکیدیں ذکر فرمائیں۔ ایک لفظ قُلْ لایا گیا دوسرا "بذالک" کے لفظ کا اضافہ کیا گیا۔ پھر تیسرے "ذالک" کے لفظ پر "فا" کا اضافہ کیا گیا۔ چوتھے "یفرحوا" کے لفظ پر "فا" کا اضافہ اور "لام" تاکید کا اضافہ کیا گیا۔ پانچویں بِفَضْلِ اللّٰہِ میں جار مجرور کو مقدم لا کر حصر کا فائدہ دیا گیا۔ چھٹے رحمت کے لفظ پر "ب" دوبارہ لائی گئی۔ الغرض اس کلام کو رب نے کئی تاکیدوں کے ساتھ مؤکد کر دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رب علام الغیوب ہے۔ اس کو پتہ تھا کہ ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا کہ میرے محبوب کے "میلاد" منانے کو شرک و بدعت کہا جائے گا اور اس سے روکا جائے گا اس لئے رب نے پہلے ہی سے قرآن میں اپنے محبوب کے میلاد پر خوشیاں منانے کے حکم پر کئی تاکیدوں کے ساتھ مؤکد کر کے مسلمانوں کو بتا دیا کہ دیکھو خبردار کوئی اس کی کتنی ہی ممانعت کرے لیکن تم کسی کے بہکانے میں نہ آنا بلکہ ضرور بالضرور میرے محبوب کے میلاد کی خوشیاں منا کر میرے محبوب بن جانا۔ دیکھو کسی کی باتوں میں آ کر اس میں ذرا سی کوتاہی نہ کرنا خوب خوشیاں منانا اور مجھے راضی کر لینا۔ اول تو رب کا کہہ دینا ہی اس کے بندوں کے لئے کافی تھا چہ جائیکہ اتنی تاکیدوں کے ساتھ وہ حکم دے۔ اب بھلا کس کی مجال ہو سکتی ہے کہ وہ اس عظیم حکم سے سرتابی کرے۔ اگر اتنے پرزور حکم کے باوجود اب بھی اگر کوئی میلاد شریف نہیں مناتا یا اس کو برا سمجھتا ہے تو اس سے بڑا خدا کا نافرمان کون ہوگا......؟

☆ اس آیت کے آخیر میں فرمایا...... هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ...... کہ یہ تمہارا خوشیاں منانا اس سے بہتر ہے جو کچھ تم نے جمع کیا ہے۔ اب جمع دو ہی قسم کی چیزیں کی جاتی ہیں۔ ایک دنیا کے حوالہ سے مال دولت اور دوسرے آخرت کے حوالہ سے اعمال صالحہ۔ یعنی نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ اور صدقات و خیرات وغیرہ۔ لہٰذا اس آیت کے اب معنی یہ ہوں گے کہ خواہ تم بنگلے کوٹھیاں اپنی جائیدادیں، کاریں، بینک بیلنس الغرض یہ مادی دولت جمع کر لو یا خوب نمازیں، روزے، عمرے اور صدقات و خیرات کر کے اخروی دولت جمع کر لو لیکن یاد رکھنا

میرے محبوب کے میلاد کی خوشیاں منانا ان سب سے بہتر ہے......! دراصل اس آیت میں ان لوگوں کو جواب دے دیا جو یہ کہتے ہیں کہ میلاد شریف کے موقع پر چراغاں سجاوٹ اور جلسے جلوسوں پر پیسہ خرچ کرنے کے بجائے کسی یتیم، بیوہ وغیرہ پر خرچ کر دیا جاتا تو اچھا رہتا۔ گویا اس کا جواب دے دیا گیا کہ اپنے بچوں کی ولادت ان کی شادی بیاہ وغیرہ اپنے ملک کی آزادی یا کسی سربراہ مملکت کے آنے پر خوب خوشیاں مناتے ہو بے دریغ پیسہ خرچ کرتے ہو اس وقت تمہیں یہ بات یاد نہیں آتی۔ جب میرے محبوب اور ساری کائنات کے محسن کی آمد پر اظہار مسرت کا وقت آتا ہے تمہاری جبینوں پر شکنیں پڑ جاتی ہیں۔ یاد رکھو میرے محبوب کی آمد پر خوشیاں منانا مجھے تمہارے تمام نیک اعمال سے زیادہ پیارا ہے اور یہ اظہار مسرت تمہارے لئے بھی تمام اعمال خیر سے بدرجہ اولیٰ افضل و بہتر ہے۔ اس لئے کہ یہ اعمال نماز روزہ حج زکوٰۃ سب ہی میرے محبوب ہی کا صدقہ تو ہیں اگر یہ نہ ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ سب سے بڑی میری نعمت میرے محبوب کی آمد ہے۔ لہٰذا اس پر خوب خوشیاں مناؤ کہ یہ تمہارے تمام اعمال جو تم نے جمع کیے ہیں ان سب سے بہتر ہے۔

☆ اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں حضور ﷺ کا میلاد پاک منانے کا حکم دیا جب کہ عالم ارواح میں تمام انبیاء کی پاک روحوں کو جمع کر کے پاک مجمع میں اپنے محبوب کی آمد کا ان کے اوصاف کا ذکر کر کے میلاد مصطفیٰ کی محفل سجا کر عرش پر اپنے محبوب کا رب نے خود میلاد منایا۔ پھر قرآن میں کبھی...... لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ...... فرما کے۔ کبھی...... لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولا...... فرما کے۔ کبھی...... وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰۷﴾ فرما کے اپنے محبوب کی آمد اور ان کی ولادت کا بار بار ذکر کر کے ان کے میلاد کی محفل بار بار سجا کر یہ اشارہ فرما دیا کہ میں بھی بار بار اپنے محبوب کا میلاد قرآن میں منا رہا ہوں۔ تم بھی اپنے آقا کا بار بار میلاد منایا کرو۔ رب کی اس سنت پر عمل کرتے ہوئے تمام نبیوں نے اپنے زمانہ میں حضور ﷺ کی آمد اور ولادت کا ذکر کر کے حضور ﷺ کا میلاد منایا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس طرح میلاد

منایا...... وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ...... خود حضور ﷺ نے اپنے میلاد کی خوشی منائی اور وہ اس طرح کہ اپنا عقیقہ فرمایا۔ علامہ سیوطی فرماتے ہیں کہ عقیقہ زندگی میں دوبار نہیں ہوتا جب آپ کے دادا حضرت عبد المطلب آپ کا عقیقہ کر چکے تھے آپ کے عقیقہ کرنے کا کیا مقصد......؟ دراصل یہ آپ نے اپنے ولادت کی خوشی منائی اور بطور شکرانہ ایسا کیا تا کہ امت کے لئے میلاد پر کھانے پکانا اور دیگیں لٹانا سنت ہو جائے۔ ہم اس خوشی میں گلی اور کوچہ و بازار سجاتے ہیں۔ رب نے اپنے محبوب کی آمد پر میلاد کی خوشی میں ساری زمین کو سرسبز و شاداب کر کے سجا دیا، قحط سالی دور ہو گئی اور خوش حالی ہریالی اور تر و تازگی سے روئے زمین پر نکھار آ گیا۔ ہر طرف سبز مخملی چادر بچھا دی گئی اور درخت پھلوں اور پھولوں سے مزین کر دیئے گئے۔ ہم بندے ٹیوب لائٹ اور مرچیں لگا کر گلی کوچوں کو روشن کرتے ہیں۔ رب نے اپنے محبوب کی آمد پر ایسا عظیم چراغاں کیا کہ حضرت بی بی آمنہ کے بطن سے ایسا نور ظاہر فرمایا جس سے شرق و غرب سارا جہاں روشن ہو گیا۔ (سیرت حلبیہ ص 91/ طبقات ابن سعد) ہم اس خوشی میں جھنڈے لگاتے ہیں رب نے بھی فرشتوں کے ذریعہ تین جھنڈے لگوائے۔ ایک مشرق میں ایک مغرب میں اور ایک کعبۃ اللہ کی چھت پر۔ ہم میلاد کی خوشی میں لڈو اور مٹھائیاں تقسیم کرتے ہیں۔ رب نے اپنی شان کے لحاظ سے دنیا بھر کی عورتوں کو اس خوشی میں لڑکے ہی لڑکے عطا فرمائے۔ (انوار محمدیہ لنبہانی ص 22/ السیرۃ الحلبیہ ص 78) الغرض رب نے اپنے محبوب کے میلاد کی خوشیاں منانے کا حکم دے کر اور خود بھی خوشیاں منا کر قیامت تک کے لئے میلاد منانے کو اپنی سنت اور اپنے خاص قرب کا ذریعہ بنا دیا۔ لہٰذا آج جو میلاد کی خوشیاں منائے گا وہ سنت الٰہیہ اور سنت انبیاء اور سنت مصطفیٰ اور سنت اولیاء پر عمل پیرا ہو گا۔

آیت نمبر (28)

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿٢١٧﴾ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿٢١٨﴾ وَ تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ﴿٢١٩﴾ (شعراء)

"آپ توکل اسی ذات پر کریں جو غالب و رحیم ہے وہ آپ کو دیکھتا ہے جب آپ قیام کرتے ہیں اور آپ کا سجدہ کرنے والوں میں گردش کرنا بھی ملاحظہ کرتا ہے"۔

فائدہ

اس آیت مبارکہ میں فرمایا گیا کہ سجدہ کرنے والوں میں آپ کی گردش اور آپ کے منتقل ہونے کو اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نور جو آپ کے آباؤ اجداد کی پشتوں میں منتقل ہوتا رہا اور گردش کرتا رہا۔ رب اس کو بھی دیکھ رہا تھا۔ (ابونعیم / مسالک الحنفاء ص 40) تفسیر جمل 396/3، تفسیر صاوی 287/2 اور تفسیر کبیر میں بھی اسی قسم کی تفسیر کی گئی ہے کہ "ساجدین" سے وہ مومن مرد اور عورتیں مراد ہیں جن کی پشتوں اور رحموں میں آپ کا نور منتقل ہوتا رہا اس کو رب دیکھ رہا تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آباؤ اجداد حضرت آدم و حوا علیہما السلام سے لے کر حضرت عبداللہ اور حضرت آمنہ رضی اللہ عنہما تک سب کے سب مومن تھے۔ کیونکہ اس آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہ تمام آباؤ اجداد اور امہات جن کی پشتوں اور رحموں میں آپ کا نور منتقل ہوتا رہا ان کو قرآن نے ساجدین سجدہ کرنے والے کہا جس سے معلوم ہوا کہ ان میں سے کافر اور مشرک کوئی بھی نہیں تھا بلکہ سب صاحب ایمان تھے۔ اس کی تصدیق قرآن کی اس دوسری آیت سے بھی ہوتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے والد اور مولود دونوں کی قسم ارشاد فرمائی ہے کہ وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ۝ (بلد) اس کی تفسیر بیان کرتے ہوئے حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں وَالِدٍ سے مراد حضور کے آباؤ اجداد ہیں اور وَّمَا وَلَدَ سے خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی مراد ہے۔ (تفسیر مظہری جلد 10 ص 264) اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آباؤ اجداد کی قسم ارشاد فرما کے ان کی عظمت اور کرامت کا اظہار کر کے ان کے ایمان کو بیان فرما دیا۔ کیونکہ قسم عزت و عظمت والی چیز کی کھائی جاتی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں عزت و

عظمت صرف اسلام میں ہے۔ چنانچہ فرمایا...... وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ...... اس سے ثابت ہوا کہ حضور ﷺ کے آباؤ اجداد سب مومن ہونے کے باعث معزز تھے۔ جب ہی تو لائق قسم قرار پائے۔ بعض لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ معاذ اللہ حضور ﷺ کے والدین کریمین کافر تھے۔ انہیں یہ سوچنا چاہئے کہ معاذ اللہ اگر وہ کفر پر ہوتے تو اللہ تعالیٰ قرآن میں ان کو "ساجدین" کے لقب سے کیوں یاد کرتا اور ان کی قسم کیسے ارشاد فرماتا......؟ جب کہ ایک صحیح حدیث مبارک میں خود حضور ﷺ نے اس کا رد فرمایا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جب بھی نسل انسانی دو حصوں میں بٹی تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس میں کیا جو ان دونوں میں بہتر تھا۔ اپنے والدین کے یہاں میری ولادت اس حال میں ہوئی کہ زمانہ جاہلیت کی کسی برائی نے مجھے نہیں چھوا۔ آدم سے لے کر میرے والدین تک میرے اجداد اور جدات میں کہیں بھی کوئی بدکاری نہیں پائی جاتی۔ میں تم سب سے نفس کے لحاظ سے بھی بہتر ہوں اور باپ کے لحاظ سے بھی۔ (تفسیر مظہری)

اس حدیث مبارک سے واضح طور پر ثابت ہو گیا کہ حضور ﷺ کے تمام آباؤ اجداد اور امہات وجدات سب کے سب کفر اور فسق و فجور سے پاک تھے۔ المعجم الاوسط میں امام طبرانی نے جو روایت نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا میں نے اپنی والدہ ماجدہ کے لئے رب کی بارگاہ میں عرض کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو میری خاطر زندہ فرمایا وہ مجھ پر ایمان لائیں اور اس کے بعد پھر برزخ کی طرف لوٹ گئیں تو اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ وہ پہلے مسلمان نہیں تھیں۔ زندہ کر کے ان کو مسلمان کیا گیا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو زندہ کر کے اور حضور ﷺ کا کلمہ پڑھوا کے صحابیت کے مرتبہ اور بلند و بالا درجات پر فائز کرنا مقصود تھا۔ اس لئے ان کو زندہ کر کے حضور ﷺ کا کلمہ پڑھوایا گیا (نبراس ص 527) وہ احادیث جن سے حضور ﷺ کے والدین کریمین کا کفر ہونا پتہ چلتا ہے وہ سب منسوخ ہیں۔ اس حدیث سے جس میں زندہ کر کے ان کو کلمہ پڑھانے کا ذکر ہے۔ کیونکہ یہ واقعہ ہے حجۃ الوداع کا۔ اس کے علاوہ کفر والی حدیثیں منسوخ ہیں اس آیت مبارکہ سے بھی جس میں اللہ

تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۞ ہم اس وقت تک کسی قوم کو عذاب نہیں دیں گے جب تک کوئی نہ کوئی رسول ان کے پاس بھیجا نہ جائے (اسراء) یعنی ایسا دور جس میں کوئی شریعت اپنی اصلی حالت میں موجود نہ ہو نہ ہی کسی رسول نے اپنی رسالت کا اعلان کیا ہو ایسے دور کو ''دور فترۃ'' کہتے ہیں اور اس دور کے لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ اس آیت میں اعلان فرما رہا ہے کہ میں ان کو عذاب نہیں دوں گا تو چونکہ حضور ﷺ کے والدین کا بھی دور فترۃ سے تعلق تھا۔ کیونکہ آپ کے والد گرامی اس وقت فوت ہو گئے تھے جب حضور ﷺ ابھی شکم مادر میں تھے اور آپ کی والدہ کا اس وقت انتقال ہوا تھا جب آپ کی عمر شریف صرف چار سال کی تھی اور آپ نے ابھی نبوت کا اعلان نہیں فرمایا تھا۔ لہٰذا قرآنی اصول کے مطابق کیونکہ آپ کے والدین ''اہل فترۃ'' سے ہیں لہٰذا آپ ﷺ جنتی ہیں اور آپ کو عذاب نہیں ہوگا۔ لہٰذا اس آیت کے خلاف اگر کوئی حدیث ہے جس سے آپ کے عدم ایمان کا اظہار ہوتا ہو تو وہ منسوخ سمجھی جائے گی اور قرآن کے مقابلہ میں اس حدیث پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ (التعظیم والمنۃ لجلال الدین سیوطی ص 47)

بہر حال صحیح اور درست عقیدہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کے والدین کریمین صاحب ایمان اور جنتی ہیں۔ حضرت علامہ آلوسی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ جو لوگ معاذ اللہ حضور ﷺ کے والدین کو کافر کہتے ہیں مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ خود کافر نہ ہو جائیں......! آپ فرماتے ہیں کہ کسی کے ماں باپ کو کہہ دو کہ وہ جہنمی ہیں تو اس کو کتنی ایذاء پہنچے گی۔ لہٰذا جو لوگ حضور ﷺ کے والدین کے متعلق ایسی باتیں کرتے ہیں وہ دراصل حضور ﷺ کو ایذاء پہنچا رہے ہیں۔ جب کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے...... اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ...... کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو ایذاء پہنچا رہے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں اللہ کی لعنت اور پھٹکار پڑتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے گستاخانہ عقیدوں سے مسلمانوں کو محفوظ رکھے۔

آیت نمبر (29)

قَالَ الَّذِیۡ عِنۡدَهٗ عِلۡمٌ مِّنَ الۡکِتٰبِ اَنَا اٰتِیۡکَ بِهٖ قَبۡلَ اَنۡ یَّرۡتَدَّ اِلَیۡکَ طَرۡفُکَ (نمل:40)

''اور جس کے پاس کتاب کا علم تھا اس نے کہا کہ میں اس کو (تخت کو) آپ کے پاس حاضر کردوں گا آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے''۔

فائدہ

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے غلاموں سے کہا کہ تم میں سے کون بلقیس کے تخت کو اس کے یہاں پہنچنے سے پہلے لے کر آ سکتا ہے۔ایک جن کھڑا ہوا اور عرض کرنے لگا کہ میں اس تخت کو اس مجلس کے برخاست ہونے سے پہلے لے کر آ سکتا ہوں۔آپ نے فرمایا نہیں مجھے اس سے بھی جلدی وہ تخت یہاں چاہئے۔یہ سن کر آپ کے ایک غلام آپ کی امت کے ایک ولی آصف بن برخیا کھڑے ہوئے اور انہوں نے عرض کیا کہ میں اس تخت کو آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے لے آؤں گا۔چنانچہ آپ نے پلک جھپکی تو وہ تخت آپ کے سامنے تھا......!

قرآن کے اس واقعہ سے سب سے پہلا فائدہ تو یہ حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کی امت کے اولیاء کو یہ روحانی طاقتیں عطاء فرمائی ہیں کہ وہ ملک سبا سے بیت المقدس تک جو تقریباً ڈیڑھ ہزار میل کی مسافت بنتا ہے۔وہاں سے ایک ایسے بھاری بھرکم تخت کو جو اسی گز لمبا اور چالیس گز چوڑا تھا اور ہیرے جواہرات اور چاندی سے مرصع تھا اس کو ایک سیکنڈ میں بلکہ اس سے بھی پہلے پلک جھپکنے کے اندر لے کر آ سکتے ہیں۔جب حضرت سلیمان علیہ السلام کی امت کے اولیاء کی یہ شان ہے تو امام الانبیاء کی امت کے اولیاء جن کے لئے حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ انبیائے بنی اسرائیل کی طرح ہیں۔ان کی روحانی طاقتوں کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔اس آیت سے ثابت ہو گیا کہ جب ایک اللہ تعالیٰ کا ولی اپنی جگہ پر بیٹھ کے سینکڑوں میل دور شاہی محل میں رکھے ہوئے تخت کو دیکھ بھی رہا ہے اور اپنا ہاتھ بڑھا

کر وہاں سے اس کو آن واحد میں لا رہا ہے تو پھر حضور ﷺ کی امت کے اولیاء دور دراز پھیلے ہوئے اپنے مریدوں، غلاموں اور چاہنے والوں کی حالت زار کو کیوں نہیں دیکھ سکتے ......؟ اور مشکل وقت میں جب وہ ان کو پکاریں گے تو وہ ان کی کیوں نہیں مدد کریں گے۔ یقیناً وہ ان کی دستگیری فرماتے ہیں۔ دیکھئے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی کے منبر پر بیٹھ کر سینکڑوں میل دور نہاوند کے مقام پر میدان جنگ میں اسلامی لشکر کو دیکھ بھی لیا اور منبر پر بیٹھے بیٹھے...... یاساریۃ الجبل...... فرما کے ان کی مدد بھی فرمائی۔ اتنے فاصلہ پر بغیر کسی وائرلیس اور ٹیلی فون کے ان کی آواز وہاں پہنچ بھی گئی اور اس آواز پر عمل کر کے وہ جنگ میں کامیاب و کامران ہو گئے۔

ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ولیوں کے لئے قرب و بعد کی کوئی حیثیت نہیں وہ دور دراز کی مسافتوں پر اپنے غلاموں کو دیکھ بھی لیتے ہیں۔ ان کی فریادوں کو سن بھی لیتے ہیں اور وہیں بیٹھے بیٹھے ان کی مدد بھی فرمادیا کرتے ہیں۔ اگر کوئی اس کا انکار کرتا ہے تو وہ درحقیقت قرآن کا انکار کر رہا ہے کہ یہ حقیقت قرآن سے ثابت ہے۔ لہٰذا حضرت غوث پاک رحمت اللہ تعالیٰ علیہ نے جو یہ فرمایا ہے کہ میں روئے زمین کو ایک رائی کے دانہ کے برابر دیکھتا ہوں پھر فرمایا کہ میرا مرید مشرق میں ہو اور میں مغرب میں ہوں اور اس کا ستر کھل جائے تو میں اپنے مقام پر بیٹھے بیٹھے وہیں سے اس کی ستر پوشی کر دوں گا اور قیامت تک جو میرے سلسلہ میں آنے والا اگر ٹھوکر کھانے لگے گا تو میں اس کو سنبھال لوں گا۔ یہ آپ کا ارشاد سچ اور حق ہے۔ اسی طرح حضرت خواجہ بہاؤ الدین نقشبند رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں روئے زمین کو ناخن کے مانند دیکھتا ہوں۔ یہ بھی برحق ہے اور اس آیت کی رو سے اللہ تعالیٰ کے ولیوں کو یہ سب روحانی طاقتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہوتی ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس کے پاس کتاب یعنی توریت کا تھوڑا سا علم تھا وہ پلک جھپکنے میں تخت لے آیا۔ اس سے علم کی فضیلت بھی پتہ چل گئی کہ جس کے پاس تھوڑا سا علم تھا اس کی اتنی بڑی طاقت تھی تو جو اولیائے کرام قرآن کے علوم کے حامل ہوں گے ان کی

طاقتیں تو پھر اس سے بھی کہیں زیادہ ہوں گی جب توریت کا تھوڑا سا علم رکھنے والا سینکڑوں میل سے تختِ بلقیس کو دیکھ بھی سکتا ہے اور آن واحد میں اٹھا کر لا بھی سکتا ہے تو وہ اولیائے کرام جن کے سینے اللہ تعالیٰ کی سب سے آخری اور افضل کتاب یعنی قرآن کے علوم سے روشن و منور ہیں وہ کیوں نہیں بیڑے ترا سکتے اور مشکلیں آسان کر سکتے اور آن واحد میں ہاتھ بڑھا کر مصیبت میں گرفتار بندگانِ خدا کی دستگیری کیوں نہیں کر سکتے۔

اور جب اولیاء کی یہ شان ہے جن کے پاس قرآن کا تھوڑا سا علم ہے تو خود حضور سرورِ کونین ﷺ جن پر یہ سارا قرآن نازل ہوا اور...... اَلرَّحْمٰنُ ۙ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ؕ فرما کے رب نے جن کو سارے قرآن کے مکمل علم عطاء فرما دیئے ان کی طاقتوں اور قوتوں کا پھر کون اندازہ کر سکتا ہے۔ ان کی تو ادنیٰ سی طاقت یہ ہے کہ ان کے ایک معمولی سے اشارے پر شجر و حجر اور شمس و قمر بھی فوراً تعمیل حکم بجالاتے ہیں۔ اب بھی اگر کوئی حضور ﷺ کی طاقت و قدرت اور قوت کا انکار کرے اور کہے کہ وہ کچھ نہیں کر سکتے تو اس کے لئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی آنکھوں کانوں پر مہر لگا دی ہے جو نبی کی شان اس کو کچھ نظر ہی نہیں آ رہی۔

اشارے سے چاند چیر دیا، چھپے ہوئے خور کو پھیر لیا
گئے ہوئے دن کو عصر کیا، یہ تاب و تواں تمہارے لئے

آیت نمبر (30)

حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ یّٰۤاَیُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا یَحْطِمَنَّكُمْ سُلَیْمٰنُ وَ جُنُوْدُهٗ ۙ وَ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ۝۱۸ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا (النمل)

"یہاں تک کہ جب وہ (حضرت سلیمان علیہ السلام) چیونٹیوں کی وادی سے گزرے تو ایک چیونٹی کہنے لگی اے چیونٹیو اپنے بلوں میں گھس جاؤ کہیں سلیمان اور اس کا لشکر بے خبری میں تمہیں کچل نہ ڈالیں تو (سلیمان علیہ السلام) اس کی بات سے مسکرا کر ہنس پڑے"۔

فوائد

اس آیت سے بہت سے فوائد حاصل ہوئے۔ پہلا فائدہ تو یہ حاصل ہوا کہ اگر کسی چیونٹی کو ہمارے کان کے اندر بھی رکھ دیا جائے تب بھی ہم اس کی آواز کو نہیں سن سکتے۔ جب کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے تین میل کے فاصلے سے اس چیونٹی کی آواز کو سن لیا جو اپنی ساتھی چیونٹیوں سے کہہ رہی تھی کہ سلیمان علیہ السلام کا لشکر آرہا ہے تو کہیں ہم کچلے نہ جائیں۔ لہٰذا اپنے بلوں میں گھس جاؤ۔ آپ اس کی یہ بات سن کر مسکرا دیئے۔ معلوم ہوا کہ نبی ہمارے جیسے نہیں ہوتے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہم سے کہیں زیادہ طاقتیں عطاء فرمائی ہوتی ہیں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ ان کو اپنے اوپر قیاس کر کے یہ نہیں کہنا چاہئے کہ وہ دور کی آواز نہیں سن سکتے بلکہ وہ دور و نزدیک کی ہلکی سے ہلکی آواز بھی سن لیتے ہیں۔ ان کو اپنے جیسا نہیں سمجھنا چاہئے۔

☆ دوسرا اس آیت سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام تین میل کے فاصلہ سے چیونٹی کی آواز سن سکتے ہیں تو جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے بھی نبی ہوں بلکہ سارے نبیوں کے امام ہوں وہ ہمارے آقا و مولا ﷺ مدینہ میں جلوہ گر ہوتے ہوئے ہم دور افتادہ غلاموں کی فریاد نہیں سن سکتے......؟ ان کا غلام کائنات کے کسی کونہ اور گوشہ میں ہو جب ان سے فریاد کرتا ہے تو وہ اس کی فریاد کو خود سن بھی لیتے ہیں اور فریاد رسی بھی فرماتے ہیں۔ مدینہ سے یہاں ہمارے ملکوں اور شہروں کی دوری کیا حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی شان تو یہ ہے کہ زمین پر بیٹھ کر آسمان کی آوازیں سن لیتے ہیں چنانچہ ایک روز آپ نے فرمایا اس وقت آسمان سے چرچراہٹ کی آواز آئی ہے اور اس سے ایسی آواز آنی بھی چاہئے کیونکہ اس میں کوئی ایک قدم بھر جگہ بھی ایسی نہیں جہاں فرشتے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ کناں نہ ہوں۔ لہٰذا اس کی وجہ سے یہ آواز آئی ہے۔ (ترمذی / تفسیر کبیر، زیر آیت اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰی اٰدَمَ) یہ تو آسمان کی آواز تھی۔ میرے نبی کی شان تو یہ ہے کہ ساتوں آسمانوں کے اوپر جنت ہے۔ معراج کی رات حضور ﷺ وہاں تھے اور زمین پر حضرت بلال چل رہے تھے۔ تو

سرکار نے فرمایا اے بلال میں نے جنت میں تیری جوتیوں کے چلنے کی آواز سن لی تھی۔ (بخاری و مسلم) حضرت حارثہ بن نعمان سے فرمایا کہ میں نے تمہاری تلاوت اور قرأت کی آواز جنت میں سنی تھی۔ یہ تو آواز کی بات تھی۔ میرے آقا سرورکون ومکان کا مقام تو یہ ہے کہ جہاں ظاہری آواز بھی نہیں ہوتی صرف دل میں کوئی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ میرے آقا اس دل کی آواز کو بھی سن لیتے ہیں۔ آپ نے خود فرمایا اللہ کی قسم تمہارا رکوع اور تمہارا خشوع و خضوع یعنی عبادت کے وقت جو کیفیت تمہارے دل میں پیدا ہوتی ہے مجھ سے وہ بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ (صحیح بخاری ج 1 ص 471) آج بھی جو حضور ﷺ کا غلام حضور ﷺ کا امتی کائنات کے جس گوشہ اور کونہ میں بیٹھ کر حضور ﷺ پر درود و سلام پڑھتا ہے تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ درود پڑھنے والے کی آواز کو میں خود سنتا ہوں۔ صحابہ کرام نے عرض کیا یارسول اللہ کیا وفات کے بعد بھی آپ سنیں گے......؟ آپ نے فرمایا ہاں وفات کے بعد بھی اسی طرح سنوں گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے جسموں کو زمین پر کھانا حرام کر دیا ہے۔ (سنن ابن ماجہ/طبرانی/جلا الافہام جلد 1 ص 74) اور میرا نبی صرف دور سے آواز سنتا ہی نہیں بلکہ مدد بھی فرماتا ہے۔ چنانچہ ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک روز وضو خانہ میں حضور ﷺ نے تین بار فرمایا...... لبیک نصرت ...... میں حاضر ہوں تیری مدد کی گئی۔ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یارسول اللہ یہاں تو کوئی نہیں ہے یہ آپ کس سے کلام فرما رہے تھے تو آپ نے فرمایا بنو کلب کا رجز خواں مجھے مدد کے لئے پکار رہا تھا تو اس کے جواب میں میں کہہ رہا تھا کہ میں حاضر ہوں اور تیری مدد کی گئی۔ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ تین دن کے بعد جب آپ نے صحابہ کرام کو صبح کی نماز پڑھائی تو میں نے سنا کہ وہ ہی رجز خواں حضور ﷺ کی خدمت میں مدحیہ اشعار پیش کر رہا تھا۔ (طبرانی معجم صغیر ص 20)

فریاد امتی جو کرے حال زار میں
ممکن نہیں کہ خیر بشر کو خبر نہ ہو

☆ اس آیت مبارکہ سے تیسری اہم بات یہ ثابت ہوئی کہ چیونٹی نے اپنی ساتھی چیونٹیوں سے کہا کہ بلوں میں گھس جاؤ کہیں حضرت سلیمان علیہ السلام کا لشکر تمہیں بے خبری میں نہ کچل دے۔ معلوم ہوا کہ چیونٹی کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ نبی کے ساتھی ان کے صحابی کسی پر جان بوجھ کر کبھی ظلم نہیں کرتے۔ اسی لئے اس نے کہا کہ...... لایشعرون...... یعنی بے خبری میں کہیں نہ کچل دیں ورنہ قصداً وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ لہٰذا آج جو لوگ حضور ﷺ کے صحابہ کرام کے لئے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ معاذ اللہ انہوں نے حضرت علی یا حضرت بی بی عائشہ اور دیگر اہل بیت اطہار پر ظلم کیا تھا وہ چیونٹی سے بھی کم عقل ہیں۔ صحابہ سب آپس میں ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ ایک دوسرے پر اپنی جانیں نچھاور کرتے تھے۔ بھلا ان سے کیسے تصور ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ہی ساتھیوں پر ظلم کرتے۔ وہاں ظلم کا کیا کام۔ وہاں تو حلم ہی حلم اور کرم ہی کرم تھا۔

☆ اس آیت میں ذکر ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام چیونٹی کی بات سن کر ہنس دیئے۔ معلوم ہوا کہ نبی ہر زبان اور ہر بولی کو جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑا وسیع علم عطاء فرمایا ہے۔ بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ حضور ﷺ مختلف علاقوں کے اپنے امتیوں کی زبانیں اور بولیاں کیسے سمجھیں گے تو اس کا جواب آ گیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جب چیونٹی کی زبان سمجھ سکتے ہیں اور میرا نبی جب اونٹ بکری ہرن اور چڑیا کی زبانیں سمجھتا ہے تو کیا اپنے مختلف زبانیں بولنے والے امتیوں کی زبان نہیں سمجھ سکتے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک اونٹ حضور ﷺ کے پاس سے گزرا تو اس نے ایک آواز نکالی۔ آپ نے فرمایا اس کے مالک کو بلاؤ۔ جب اس کا مالک آپ کے پاس آیا تو آپ نے فرمایا کہ اس اونٹ کو میرے ہاتھ فروخت کر دو۔ اس نے عرض کی کہ ہم تو آپ کو بغیر قیمت کے ہی پیش کر دیتے لیکن ہمارا سارا گزر بسر اسی اونٹ پر ہے۔ آپ نے فرمایا اونٹ اپنے ہی پاس رکھو لیکن دیکھو اس نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ میرا مالک مجھ سے کام زیادہ لیتا ہے اور چارہ کم دیتا ہے۔ لہٰذا آئندہ ایسا مت کرنا اور اس کا خیال رکھنا۔ جب آپ کچھ آگے گئے تو ایک درخت زمین

کو چیرتا اور دوڑتا ہوا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی ٹہنیاں اور پتے آپ پر جھکا دیئے اور تھوڑی دیر بعد واپس چلا گیا۔ آپ نے فرمایا اس درخت نے پروردگار عالم سے اجازت مانگی تھی کہ میں تیرے حبیب کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام عرض کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ اس کو اجازت مل گئی۔ وہ سلام کرنے حاضر ہوا تھا پھر چلا گیا۔ (مشکوٰۃ ص 540) ثابت ہوا کہ جب نبی اونٹ اور درختوں کی بولیاں سمجھ کر ان کی فریادرسی فرما سکتا ہے وہ مختلف زبانیں بولنے والے اپنے امتیوں کی بولیاں بھی سمجھ سکتا ہے اور ان کی فریادرسی بھی فرما سکتا ہے۔

☆☆

آیت نمبر (31)

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۱۸﴾ (فتح)

"بے شک اللہ تعالیٰ ایمان والوں سے راضی ہو گیا جب کہ وہ آپ سے بیعت کر رہے تھے درخت کے نیچے تو اللہ تعالیٰ نے جان لیا جو کچھ ان کے دلوں میں تھا پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر سکینہ یعنی اطمینان اتارا اور جلد آنے والی فتح کا انعام دیا"۔

فائدہ

یہ آیت کریمہ ان صحابہ کرام کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے حدیبیہ کے موقع پر حضور ﷺ کے ہاتھ پر ایک ببول کے درخت کے نیچے بیعت کی تھی۔ اس بیعت میں حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت علی بھی موجود تھے۔ جب کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ نے مکہ میں دشمنوں سے بات چیت کے لئے بھیجا تھا۔ جب ان کی شہادت کی جھوٹی خبر مسلمانوں میں پھیلی تو حضور ﷺ نے مسلمانوں کے اس جوش و جذبہ کو دیکھتے ہوئے اور اس کی قدر کرتے ہوئے صحابہ سے جہاد کی بیعت لی اور اپنے بائیں ہاتھ کو اٹھا کر فرمایا کہ اے اللہ یہ عثمان کا ہاتھ ہے اور اپنے دائیں ہاتھ کو اٹھا کر فرمایا کہ

یہ محمد رسول اللہ کا ہاتھ ہے اور اس طرح غائبانہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے بھی بیعت لے کر ان کو بھی اس بیعت کی برکتوں میں شامل فرمالیا۔ اس آیت سے بہت سے فوائد حاصل ہوئے۔

☆ پہلا فائدہ تو یہ حاصل ہوا کہ اس بیعت میں شامل ہونے والوں کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں ''مؤمنین'' کے لقب سے یاد فرمایا ہے۔ جب کہ اس بیعت میں تینوں خلفاء اور ان تینوں کو حضور ﷺ کے بعد حضور ﷺ کا خلیفہ اور امام ماننے والے صحابہ بھی موجود تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ تینوں خلفاء اور ان کے ماننے والے صحابہ سب مومن اور کامل الایمان ہیں۔ کیونکہ ان کے ایمان کی گواہی خود قرآن دے رہا ہے۔ لہٰذا معاذ اللہ اگر آج کوئی ان کو یہ کہتا ہے کہ یہ اسلام سے نکل گئے تھے تو وہ درحقیقت قرآن کا انکار کر رہا ہے اور قرآن کو معاذ اللہ جھوٹا بتا رہا ہے۔ ساتھ ساتھ حدیث کا بھی انکار ہے، کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا جس نے درخت کے نیچے بیعت کی اس میں سے کوئی بھی دوزخ میں نہیں جائے گا۔ لہٰذا معاذ اللہ ان بیعت کرنے والے خلفاء اور دیگر صحابہ کو کافر و غاصب اور جہنمی بتانا درحقیقت قرآن و حدیث کا انکار کرنا ہے۔

☆ بعض لوگ جو صحابہ کے مخالف ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس وقت بیعت کے وقت تو یہ مومن تھے لیکن بعد میں معاذ اللہ کافر ہو گئے تھے تو اس کا جواب بھی اسی آیت میں اللہ تعالیٰ نے دیدیا۔ فرمایا لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ کہ اللہ ان سے راضی ہو گیا۔ ظاہر ہے جس سے خدا راضی ہو گیا اس کا یقیناً انجام بھی بخیر ہو گا اور آخر تک اس سے مرضی مولیٰ کے خلاف کوئی کام صادر نہیں ہو گا۔ کیونکہ خدا علام الغیوب ہے۔ اگر آئندہ ان سے کوئی غلط کام یا کوئی کفریہ کام صادر ہونے والا ہوتا تو اس آیت میں اللہ تعالیٰ کبھی بھی ان سے اپنی رضا مندی اور اپنی خوشنودی کا اظہار نہ کرتا۔ اس علام الغیوب رب کی طرف سے ان کے لئے رضامندی کا اعلان اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ان کے انجام کو بھی دیکھ رہا تھا کہ ان سے آخر تک کوئی کام مرضی مولیٰ کے بغیر صادر ہونے والا نہیں تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان سے اپنی رضا

اور خوشنودی کا اعلان فرما دیا۔

☆ اس آیت سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ حضرت ابوبکر حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کی خلافتیں بھی برحق تھیں۔ کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ ان تینوں خلفاء اور ان کی خلافتوں کو تسلیم کرنے والے اور ان کو اپنا امام ماننے والوں کو نہ صرف یہ کہ مومن کامل کے خطاب سے نواز رہا ہے بلکہ ان سے اپنے راضی ہونے کا اعلان بھی فرما رہا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کی خلافتیں حق تھیں۔ اگر معاذ اللہ ان کی خلافتیں ظلم اور غصب سے حاصل کردہ ہوتیں تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے کبھی بھی اپنی رضامندی کا اعلان نہ فرماتا۔ پھر دوسری بات یہ کہ اسی آیت میں آگے فرمایا گیا کہ ہم نے ان پر اطمینان اور سکینہ نازل فرمایا یعنی اب انہیں سوء خاتمہ کا کوئی اندیشہ نہیں۔ جب انہیں اللہ تعالیٰ کی رضا مل گئی تو اب شرک و کفر اور فسق و فجور کا وہاں کیا کام۔ اب وہاں ہر برائی سے طمانیت اور اطمینان ہے کہ کوئی برائی ان کے پاس نہیں آنے پائے گی۔ لہٰذا بعد میں ان کے معاذ اللہ گمراہ ہونے کا خیال بھی مت لانا۔

☆ اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اولیائے کرام جو مریدوں سے نیک اعمال کے کرنے اور برے اعمال سے بچنے پر بیعت لیتے ہیں۔ وہ حضور ﷺ کی سنت ہے۔ کیونکہ یہاں بھی حضور ﷺ نے ایک اہم عمل یعنی جہاد پر بیعت لی، لیکن یہ بیعت لینے کا حق اسی کو ہے جو نبی کے علم ظاہر اور علم باطن دونوں کا وارث ہو۔ صحیح عقیدہ رکھتا ہو اور متبع شریعت ہو اور جن میں یہ صفات نہ ہوں ان سے بیعت کرنا درست نہیں۔

☆ اس آیت سے حضور ﷺ کا علم غیب بھی ثابت ہو گیا کہ آپ نے اپنے ایک ہاتھ کو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ قرار دے کر ان سے بھی بیعت لی گویا یہ اشارہ فرما دیا کہ حضرت عثمان غنی شہید نہیں ہوئے۔ یہ خبر غلط ہے بلکہ وہ تو زندہ ہیں جب ہی تو ان سے بھی تمہاری طرح بیعت لے رہا ہوں۔

☆☆

آیت نمبر (32)

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَ لَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا (نور:55)

''اللہ تعالیٰ نے وعدہ دیا ان کو جو تم میں سے ایمان لائے اور اچھے کام کئے کہ ضرور بالضرور خلیفہ بنائے گا ان کو زمین میں جیسے بنایا تھا ان لوگوں کو جو ان سے پہلے تھے اور ضرور بالضرور ان کے لئے جمادے گا ان کا دین جو ان کے لئے اس نے پسند فرمایا ہے اور ضرور بالضرور ان کے اگلے خوف کو امن سے بدل دے گا''۔

فائدہ

تمام مفسرین کرام اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمارہے ہیں کہ اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے خلفائے راشدین کی خلافت کا اعلان فرمایا ہے اور اس آیت سے حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان ذوالنورین، حضرت علی رضی اللہ عنہم ان چاروں خلفاء کی خلافت کا حق ہونا اور ان میں سے ہر ایک کا خلیفہ راشد اور امام برحق ہونا ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو خلافت دینے اور ان کو خلیفہ بنانے کا وعدہ فرمایا ہے۔ لیکن اس سے عام مسلمان حکمرانوں یا بنو عباس یا بنو امیہ کے خلفاء یا امام مہدی وغیرہ کی خلافت اور حکومت مراد نہیں ہے۔ کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا ہے اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ کہ تم صحابہ کرام میں سے جو اس وقت (نزول آیت سے پہلے) ایمان لا چکے ہیں ان کو خلافت دوں گا۔ ظاہر ہے وہ صرف حضرت ابوبکر صدیق حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی رضی اللہ عنہم کے سواء اور کوئی نہیں۔ کیونکہ یہی وہ چاروں صحابہ ہیں جو نزول آیت کے وقت ایمان لا چکے تھے اور ان ہی کو خلافت ملی تو معلوم ہوا کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں سے جس خلافت کے دینے کا وعدہ

فرمایا تھا وہ یہی خلافت راشدہ ہے جو حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کی صورت میں مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطاء کی گئی۔ لہٰذا جو خلافت اور حکومت وعدہ کر کے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی عطاء فرمائی ہو اس کے عطیہ الٰہی، نعمت الٰہی اور محبوب الٰہی ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے......؟

☆ اس کے علاوہ اس آیت مبارکہ میں اس خلافت کی دو نشانیاں بھی اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس خلافت میں دین کو اللہ تعالیٰ جما دے گا اور خوب فروغ عطا فرمائے گا۔ چنانچہ یہ نشانی بھی صرف اسی خلافت راشدہ میں نظر آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے مطابق اس دور میں دین کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ عرب و عجم میں اسلام پھیل گیا۔ دو سپر پاور روم اور ایران مسلمانوں کے زیر نگیں آ گئے۔ قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج مسلمانوں کے پاؤں تلے تھے۔ ہر طرف اسلام کا پرچم لہرا رہا تھا۔ الغرض اس خلافت راشدہ کے دور میں اسلام کو جو عروج حاصل ہوا وہ کسی اور دور میں نہیں ہوا۔ اس لحاظ سے بھی جس خلافت کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں وعدہ فرمایا ہے وہ خلافت راشدہ کے سواء اور کوئی خلافت نہیں۔ دوسری نشانی اس آیت میں یہ بیان فرمائی گئی کہ اس خلافت کے دور میں مسلمانوں کا خوف امن سے بدل جائے گا۔ یہ نشانی بھی خلافت راشدہ میں بدرجہ اتم موجود تھی کہ مسلمانوں کو اپنی قوت اور فوقیت اور عظمت کے باعث تمام اندرونی اور بیرونی ہر قسم کے خوف سے نجات مل گئی تھی اور مسلمان ایک عظیم طاقت کی صورت میں دشمنوں سے بے خوف ہو کر حکمرانی کر رہے تھے۔

سہا ڈر نہ بیڑے کو موج بلا کا
ادھر سے ادھر پھر گیا رخ ہوا کا

الغرض حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان کی وہ خلافت اور حکومت جو اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرما کے مسلمانوں کو عطاء فرمائی ہو اور جس میں اسلام کو خوب عروج حاصل ہوا ہو اور بے خوفی اور امن و سکون کا بول بالا ہو گیا ہو۔ ایسی حکومت کو ظلم و جبر اور غضب کی حکومت کہنا

یہ صریح اس آیت کا انکار ہے۔ جب کہ حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان کی خلافت کا انکار صرف قرآن ہی کا انکار نہیں بلکہ حدیث کا بھی انکار ہے۔ کیونکہ ان تینوں کی خلافت مشہور احادیث سے بھی ثابت ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک عورت نے حضور ﷺ سے کسی معاملہ میں گفتگو کی۔ آپ نے اس سے فرمایا پھر آنا۔ اس نے عرض کیا کہ اگر آپ کو نہ پاؤں تو پھر کس کے پاس جاؤں۔ آپ نے فرمایا ابو بکر کے پاس چلی جانا۔ (بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد) اسی طرح ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ قبیلہ بنی مصطلق کے لوگوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ کے پاس بھیجا کہ آپ سے پوچھ کر آئیں کہ آپ کے بعد زکوۃ کس کو دیں۔ آپ نے فرمایا ابو بکر کو۔ انہوں نے پھر بھجوایا کہ ابو بکر کے بعد کس کو دیں۔ آپ نے فرمایا عمر کو۔ انہوں نے پھر بھجوایا کہ عمر کے بعد کس کو دیں۔ آپ نے فرمایا عثمان کو (حاکم) گویا بالترتیب خلفائے راشدین کی آپ نے اپنی زندگی میں ہی نشاندہی فرما دی تھی۔ بہر حال خلفائے راشدین کی خلافت قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ لہٰذا اس کا انکار کرنا بہت سی آیات اور احادیث کا انکار کرنا ہے۔

☆☆

آیت نمبر (33)

وَالَّذِیۡنَ جَآءُوۡ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَا اغۡفِرۡ لَنَا وَلِاِخۡوَانِنَا الَّذِیۡنَ سَبَقُوۡنَا بِالۡاِیۡمَانِ وَلَا تَجۡعَلۡ فِیۡ قُلُوۡبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا رَبَّنَاۤ اِنَّکَ رَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۰﴾ (حشر)

”جو لوگ مہاجرین و انصار کے بعد آئیں یہ کہتے ہوئے کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ایمان میں ہم سے سابق تھے ان کو بھی بخش دے اور نہ رکھ ہمارے دلوں میں کوئی عداوت ان لوگوں کی جو ایمان لائے۔ اے ہمارے پروردگار یقیناً تو نرمی فرمانے والا اور مہربان ہے“۔

فائدہ

اس آیت مبارکہ سے پہلی آیات میں تفصیل کے ساتھ مہاجرین و انصار، صحابہ کرام کا ذکر فرمایا گیا اور ان کے لئے کہا گیا کہ مہاجرین صحابہ ایسے اللہ تعالیٰ کے خالص اور نیک بندے تھے کہ انہوں نے اپنے رب کی رضا اور فضل حاصل کرنے کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا وہ اللہ اور اس کے رسول کے مددگار تھے اور سچے لوگ تھے اور انصار صحابہ کے لئے فرمایا کہ وہ مہاجرین سے بے لوث محبت کرتے تھے۔ وہ حرص و حسد سے پاک تھے اور خود صاحب حاجت ہونے کے باوجود مہاجرین بھائیوں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے تھے۔ وہ دین و دنیا میں کامیاب اور کامران ہیں...... اس سے ثابت ہوا کہ جن صحابہ کرام کی ان کا رب ان کا خالق و مالک اتنی تعریفیں کر رہا ہے۔ اتنے اوصاف بیان فرما رہا ہے اور دین و دنیا میں ان کو کامیاب فرما کے ان کے بہترین انجام سے ہمیں باخبر کر رہا ہے۔ بھلا ایسے مقدس اور پاکیزہ صحابہ کو کافر یا فاسق و فاجر کیسے کہا جاسکتا ہے......؟ اس آیت کے بعد اب ان کے متعلق یہ گمان بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ معاذ اللہ ہدایت پر نہیں رہے تھے یا معاذ اللہ اسلام سے نکل گئے ایسا عقیدہ رکھنا اس آیت کا صریح انکار ہے۔

☆ تیسرا گروہ اس آیت میں ان مسلمانوں کا بیان کیا گیا جو مہاجرین و انصار کے بعد آئیں گے اور ان مہاجرین و انصار کے لئے استغفار یعنی دعائے خیر اللہ تعالیٰ سے کریں گے اور ان کی طرف سے کوئی بغض و عداوت اپنے دلوں میں نہیں رکھیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مہاجرین و انصار صحابہ کرام کی طرف سے دل میں بغض و عداوت رکھنا اور ان کے لئے بجائے دعائے خیر کے برے الفاظ زبان سے نکالنا یہ مسلمانوں کا شیوہ نہیں۔ کیونکہ اس آیت میں مسلمانوں کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ صحابہ کی طرف سے کوئی کینہ اپنے دل میں نہیں رکھیں گے۔ بلکہ ان کو ہمیشہ دعائے خیر سے یاد کریں گے...... اہل بیت اطہار کا بھی یہی عقیدہ تھا چنانچہ حضرت امام زین العابدین کے پاس کچھ لوگ عراق سے آئے اور آپ کے سامنے حضرت ابوبکر صدیق حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان غنی رضی

اللہ عنہ کی برائی کرنے لگے تو آپ نے فرمایا تم نہ تو مہاجرین میں سے ہو نہ انصار ہی میں سے ہو۔ اب رہ گیا مسلمانوں کا تیسرا گروہ تو وہ وہ مسلمان ہیں جو ان دونوں کی اچھائی بیان کرتے ہیں اور قرآن کی اس آیت کی رو سے ان کی عداوت اپنے دل میں نہیں رکھتے تو ان کی برائی کر رہا ہے۔ لہٰذا تو مسلمانوں کے اس گروہ میں بھی شامل نہیں۔ گویا تو مسلمانوں کی تینوں قسموں سے نکل گیا اور جب تو مسلمان نہیں رہا تو میرے پاس سے اٹھ جا۔ حضرت امام باقر رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت ابوبکر کی برائی کرنے والوں کے لئے فرمایا کہ یہ لوگ دین سے خارج ہیں۔ (کشف الغمہ مطبوعہ ایران ص 199)

☆ تیسری بات اس آیت اور اس سے ماقبل آیات سے یہ ثابت ہوئی کہ "مالِ فے" یعنی وہ مال جو بغیر لڑائی اور فوج کشی کے دشمنوں سے حاصل کیا جائے وہ خاص کسی کی ملکیت نہیں ہوتا بلکہ وہ عام مسلمانوں کے لئے ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ بیت المال میں رکھا جائے گا اور مسلمانوں کا امیر اس کو حسب ضرورت جہاں چاہے گا استعمال کرے گا۔ لہٰذا فدک کا باغ جس کا مالِ فے میں سے ہونا مسلمہ امر ہے وہ ظاہر ہے حضور ﷺ کی ملکیت میں نہیں تھا کہ حضور ﷺ کے بعد اس میں وراثت کا مسئلہ پیدا ہوتا۔ بلکہ وہ تو مسلمانوں کا عام حق تھا۔ جس کو بیت المال میں لے کر کسی کو بھی دیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا اس مسئلہ پر کسی اعتراض کی گنجائش نہیں۔

☆ اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی تعریف فرما رہا ہے جو اپنے فوت شدہ مسلمان بھائیوں کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ فوت شدہ مسلمان بھائیوں کے لئے دعائے مغفرت کرنا لائق ثواب، اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ اور اچھا فعل ہے اور اس سے مردے کو فائدہ ہوتا ہے۔ ورنہ اگر ہماری دعائے مغفرت سے اس کو کوئی فائدہ نہ ہوتا تو ایسے بے کار اور عبث کام کی اللہ تعالیٰ تعریف فرما کے ہمیں اس کی کیوں رغبت دلاتا ہے۔ تیجہ، چالیسواں، دسواں، بیسواں عرس، کونڈے اور شب برات وغیرہ میں بھی ہم یہی کرتے ہیں کہ اپنے مردوں کی بخشش کی دعا کرتے ہیں۔ اس آیت سے ثابت ہوا کہ یہ

شرک وحرام نہیں بلکہ مستحسن اور اچھا فعل ہے اور ہمارے مردوں کی عفو ومغفرت اور بلندی درجات کا سبب بنتا ہے۔ ہماری دعاؤں سے مردوں کو کتنا فائدہ پہنچتا ہے اور ان کو اس کی کتنی خوشی ہوتی ہے اس کا اندازہ اس حدیث مبارک سے لگتا ہے کہ حضور سرور دو جہاں ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ مردہ کی حالت قبر میں ایک ڈوبتے فریاد کرنے والے کی سی ہوتی ہے جو انتظار کرتا ہے کہ اس کے ماں باپ، بہن بھائی اور دوستوں کی طرف سے اس کو کوئی دعا پہنچے اور جب اس کو کوئی دعا پہنچتی ہے تو وہ اس کو دنیا اور اس کی ہر چیز سے زیادہ محبوب اور پیاری ہوتی ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ اہل دنیا کی دعا سے اہل قبور کو پہاڑوں کے برابر اجر وثواب اور رحمت عطا فرماتا ہے اور بے شک زندوں کا تحفہ مردوں کے لئے یہی ہے کہ ان کے لئے بخشش کی دعا کی جائے۔ (مشکوٰۃ ص206)

ایک اور حدیث مبارک میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایک شخص کو جنت میں جب اعلیٰ مرتبہ عطا فرمائے گا تو وہ کہے گا کہ اے میرے رب یہ میرا درجہ اتنا بلند کیسے ہو گیا۔ حالانکہ اتنی تو میں نے نیکیاں دنیا میں نہیں کی تھیں تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا تیرا بیٹا تیرے لئے دعائے بخشش کرتا تھا اس کی وجہ سے تیرا اتنا درجہ بلند ہو گیا ہے۔ (مشکوٰۃ ص256) اس سے ثابت ہوا کہ ہمارے درود واستغفار کا مردوں کو فائدہ ہوتا ہے۔ اگر وہ گناہ گار ہوں تو ان کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اگر وہ ولی وبزرگ ہوں تو ان کے درجے بلند ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے ملا علی قاری رحمت اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اہلسنت کا اس پر اتفاق ہے کہ زندوں کے عمل سے مردوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ) حنفیوں کی بڑی معتبر عقائد کی کتاب شرح عقائد نسفی میں لکھا ہے کہ زندوں کا مردوں کے لئے دعا کرنا صدقہ و خیرات کرنا مردوں کے لئے نفع کے باعث ہوتا ہے۔ لہٰذا فاتحہ وغیرہ کے موقع پر دعائے بخشش کے ساتھ ساتھ جو کھانے کا ثواب ان کو پہنچایا جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ وہ ثواب بھی ان کو پہنچتا ہے اور ان کے نفع اور قبر وحشر کی مشکلات سے نجات کا ذریعہ بنتا ہے۔

☆☆

آیت نمبر (34)

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ﴿٣٣﴾

''اللہ تعالیٰ تو یہی چاہتا ہے کہ اے نبی کے گھر والو کہ تم سے ہر ناپاکی کو دور کر دے اور تمہیں پوری طرح مکمل پاک صاف کر دے''۔ (احزاب)

فائدہ

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ حضور اکرم ﷺ کے اہل بیت کی عظمت اور ان کے مقام کو بیان فرما رہا ہے کہ ہم ان سے ہر ناپاکی کو دور کر کے ان کو مکمل صاف ستھرا کرنا چاہتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس آیت میں جو اہل بیت کا لفظ آیا ہے اس سے کیا مراد ہے......؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اہلبیت کا لفظی ترجمہ اردو میں ''اہل خانہ'' یعنی گھر والوں کا ہوتا ہے اور وہ ظاہر ہے بیوی ہوتی ہے۔ لہٰذا یہاں بھی اہل بیت سے اصل مراد تو حضور ﷺ کی ازواج مطہرات ہیں اور یہ آیت کے سیاق و سباق کو دیکھیں تو اس معنی کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ اس آیت سے قبل اور بعد حضور ﷺ کی ازواج مطہرات کا ذکر چل رہا ہے۔ لہٰذا اس ذکر کے درمیان میں یہ آیت ہے۔ جس میں اہل بیت کا لفظ آیا ہے تو ظاہر ہے یقیناً اس سے بھی حضور ﷺ کی پاک بیویاں ہی مراد ہوں گی۔ اس کے علاوہ قرآن میں دوسرے مقام پر بھی اہل بیت کا لفظ بیوی کے لئے بولا گیا ہے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اہلیہ محترمہ حضرت سارہ کے لئے آتا ہے کہ فرشتوں نے ان سے کہا...... رحمت اللہ و برکاتہ علیکم اهل البیت...... خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اسی لفظ سے فرمایا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے وَإِذْ غَدَوْتَ مِنْ أَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِينَ (آل عمران: 121) بہر حال ثابت ہوا کہ اہل بیت سے دراصل مراد تو حضور ﷺ کی تمام ازواج مطہرات ہیں اور ان کی عظمت اور شان کو اس آیت میں بیان کیا جا رہا ہے۔ لیکن فضیلت اور عظمت میں حضور ﷺ نے اپنی پیاری بیٹی حضرت فاطمہ، پیارے

نواسے حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین اور اپنے پیارے داماد حضرت علی کو بھی شامل فرمالیا۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین کو اپنی کملی میں داخل کر کے فرمایا اے اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں۔ ان سے بھی ناپاکی کو دور کر دے اور ان کو خوب پاک کر دے۔ اس پر حضور ﷺ کی اہلیہ حضرت ام سلمہ نے عرض کیا یارسول اللہ مجھ کو بھی شامل فرمالیجئے۔ تو آپ نے فرمایا......

انت علی خیر وانت علی مکانک......تم تو اس سے بہتر حالت میں ہو اور اپنے مرتبہ پر ہو (ترمذی) یعنی یہ آیت تمہارے لئے ہی تو نازل ہوئی ہے۔ تم تو پہلے سے ہی اس میں داخل ہو اب میں ان چاروں کے لئے دعا کر کے ان کو بھی اس میں شامل کر رہا ہوں۔

لہٰذا اب اس آیت سے حضور ﷺ کے سارے گھر والے یعنی تمام ازواج مطہرات حضرت علی اور حضور ﷺ کی اولاد امجاد کی فضیلت ثابت ہو جائے گی کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مطابق حضور ﷺ کے یہ سب گھر والے ہر قسم کی اعتقادی، عملی، اخلاقی، ظاہر، باطنی، روحانی، جسمانی ہر قسم کی ناپاکی اور گندگی سے بالکل پاک ہیں۔ ان کے پاس سے بھی کسی گناہ برائی اور کسی بری بات کا کبھی گزر نہیں ہوا۔ بعض لوگ حضور ﷺ کی پیاری زوجہ محترمہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر طرح طرح کے الزامات لگاتے ہیں۔ (معاذ اللہ) بعض لوگ امام حسین رضی اللہ عنہ کی توہین اور گستاخی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انہوں نے اقتدار کی ہوس میں کربلا کا رخ کیا۔ (معاذ اللہ) وہ حق پر نہیں تھے (معاذ اللہ) الغرض جو بھی اہل بیت میں سے کسی کی بھی برائی کرتا ہے وہ درحقیقت اس آیت کا انکار کرتا ہے۔ کیونکہ خدا یہ فرمائے کہ ان میں کوئی برائی نہیں، یہ ہر گناہ سے ہر برائی سے اور رذیل عادت واخلاق سے بالکل پاک تھے اور چودھویں صدی میں کوئی ان میں برائی نکالے تو وہ سچا نہیں بلکہ ساری کائنات کا رب سچا ہے۔ اس کا قرآن سچا ہے۔ اہل بیت اطہار میں عیب نکالنے والے ان کی توہین کرنے والے جھوٹے ہیں اور قرآن کے منکر ہیں۔ جہنمی ہیں۔ کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں

میری جان ہے جس کسی نے بھی میرے اہل بیت سے بغض اور عداوت رکھی اللہ تعالیٰ نے اس کو جہنم میں داخل کیا۔ (مستدرک 150/3- زرقانی 20/7)

ایک اور مشہور حدیث ہے سرکار دو جہاں حضور ﷺ نے فرمایا میرے اہل بیت کی مثال نوح علیہ السلام کی کشتی کی سی ہے جو اس میں سوار ہو گیا وہ نجات پا گیا اور جو پیچھے رہ گیا وہ ڈوب گیا۔ اہل بیت کرام کے دامن سے وابستہ رہنے کا خود سرور دو جہاں ﷺ نے حکم دیا۔ فرمایا اے لوگو بے شک میں نے تم میں وہ چیز چھوڑی ہے کہ اگر تم اس کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ ایک وہ کتاب اللہ اور میری عترت یعنی اہل بیت ہے۔ (ترمذی باب المناقب) بہر حال ثابت ہوا کہ حضور ﷺ کے اہل بیت اطہار کی محبت ان کا ادب و احترام دین و دنیا میں کامیاب و کامرانی کا ذریعہ ہے اور ان کی عداوت دین و دنیا میں رسوائی کا موجب ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی بے ادبی اور گستاخی اور عناد سے ہمیں بچائے۔

☆☆

آیت نمبر (35)

رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ ۝

"اے ہمارے پروردگار مجھ کو اور میرے والدین کو اور مومنین کو بخش دے جس دن حساب قائم ہو"۔ (ابراہیم)

فائدہ

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا نقل کی ہے۔ ہمیں بھی اس طرح دعا مانگنے کا سلیقہ سکھایا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس دعا میں اپنے مرحوم والدین کے لئے اور مسلمانوں کیلئے دعا فرمائی۔ مسلمانوں میں زندہ اور فوت شدہ تمام مسلمان آگئے جب کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ کہ دعا عبادت ہے (ابوداؤد) تو معلوم ہوا کہ اس عبادت کا مردوں کو فائدہ پہنچتا ہے ورنہ اگر اس عبادت کا فائدہ

نہ پہنچتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کیوں دعا کرتے اور اللہ تعالیٰ ان کے اس فعل کو نقل فرما کے ہمیں اس کی کیوں ترغیب دیتا......؟ جب کہ احادیث سے بھی ثابت ہے کہ دعا جیسی عبادت کا مردوں کو فائدہ ہوتا ہے۔ چنانچہ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ جس میت پر چالیس ایسے آدمی نماز پڑھیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتے ہوں تو اللہ تعالیٰ ان کی شفاعت اور سفارش میت کے حق میں ضرور قبول فرما لیتا ہے۔ (مسلم جلد اول ص 309) یعنی ان کی دعائے مغفرت سے میت کی بخشش فرما دیتا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہماری اس دعا اور نماز جنازہ جیسی عبادت کا ہمارے مردوں کو فائدہ ہوتا ہے اور صرف اس عبادت یعنی دعا اور نماز ہی کا مردہ کو فائدہ نہیں ہوتا بلکہ ہماری دیگر عبادات کا بھی ان کو ثواب پہنچتا ہے اور اس کا بھی ان کو فائدہ ہوتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ قبیلہ جہنہ کی ایک عورت نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ میری ماں نے حج کی نذر مانی تھی، لیکن وہ بغیر حج کیے مر گئی تو کیا میں اس کی طرف سے حج کر لوں......؟ آپ نے فرمایا ہاں تو اس کی طرف سے حج کر لے (بخاری) اس حدیث سے ثابت ہوا کہ نذر ماننے کے باعث یہ حج اس پر واجب ہو گیا تھا۔ اس کی طرف سے اس کے زندہ وارث نے ادا کیا تو اس کی مرحوم والدہ کی طرف سے وہ ادا ہو گیا اور اس کو اس کے حج کا ثواب مل گیا۔ معلوم ہوا کہ زندوں کی اپنی عبادت کا ثواب اپنے مردوں کو بھیجا جائے تو اس کا ثواب ان کو پہنچتا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو آدمی قبرستان کے پاس سے گزرے اور گیارہ مرتبہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ پڑھ کر اس کا ثواب مردوں کو پہنچا دے تو اللہ تعالیٰ مردوں کی تعداد کے برابر پڑھنے والے کو بھی اجر و ثواب عطا فرماتا ہے۔ (دار قطنی، درمختار باب الدفن، شرح الصدور للسیوطی ص 130) یہ حدیث علامہ سیوطی نے لکھی ہے جن کے متعلق مولانا انور شاہ کشمیری لکھتے ہیں کہ علامہ سیوطی کو بائیس مرتبہ حضور ﷺ کی زیارت ہوئی اور انہوں نے حضور ﷺ سے پوچھ کر تصحیح کر کے حضور ﷺ کی احادیث لکھیں۔ (فیض الباری شرح بخاری جلد اول ص 204) اسی طرح حضور ﷺ نے حضرت سعد بن

معاذ رضی اللہ عنہ کو دفن کرنے کے بعد ان کی قبر پر کئی مرتبہ "سبحان اللہ اور اللہ اکبر" پڑھا اور فرمایا کہ اس نیک بندہ پر قبر تنگ ہوگئی تھی لیکن میرے یہ پڑھنے سے اس کی قبر کشادہ ہوگئی۔

(مشکوٰۃ ص 26)

تیجہ، چالیسواں، عرس گیارھویں الغرض مردوں کو جو ایصال ثواب کیا جاتا ہے اور فاتحہ دی جاتی ہے تو اس میں بھی یہی ہوتا ہے کہ قرآن پڑھ کر اور کلمہ شریف وغیرہ پڑھ کر اس کا ثواب ان کو پہنچایا جاتا ہے۔ ان مذکورہ بالا احادیث سے ثابت ہوگیا کہ ہمارا یہ فعل قرآن وسنت کے مطابق ہے اور اس سے مردوں کو نفع ہوتا ہے اور ان کی قبر کی مشکلیں آسان ہوتی ہیں اور اگر وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے ہوں تو ان کے درجات بلند ہوجاتے ہیں...... اب رہا یہ مسئلہ کہ فاتحہ اوز ایصال ثواب کے موقع پر کھانا، پھل فروٹ وغیرہ بھی رکھے جاتے ہیں۔ آیا اس کا ثواب بھی مردوں کو پہنچتا ہے یا نہیں......؟ آیئے ذرا احادیث کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ میری ماں اچانک فوت ہوگئی ہے اگر میں اس کی طرف سے کوئی صدقہ کروں تو کیا اس کا ثواب اس کو ملے گا......؟ آپ نے فرمایا ہاں، یعنی اس صدقہ کا ثواب تیری مرحومہ ماں کو مل جائے گا۔ (بخاری جلد اول ص 186/ مسلم جلد اول ص 324/ موطا امام مالک / ابوداؤد) اسی طرح حضرت سعد بن عبادہ نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ میری ماں کا انتقال ہوگیا ہے ان کے لئے کون سا صدقہ افضل ہے......؟ آپ نے فرمایا "پانی" کا۔ حضرت سعد نے کنواں کھدوایا اور کہا...... **ھذہ لام سعد**...... کہ یہ کنواں اور اس کا پانی سعد کی ماں کے لئے ہے (ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ 236/1) ان احادیث سے ثابت ہوا جب پانی اور ہر قسم کے کھانے پھل فروٹ وغیرہ الغرض تمام صدقات کا ثواب مردوں کو پہنچتا ہے اور اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اس کھانے پر اگر مردہ کا نام لے دیا جائے تو وہ فاتحہ کا کھانا حرام نہیں ہوجاتا جیسے حضرت سعد نے اس کنویں پر اپنی ماں کا ذکر کرکے کہا کہ یہ میری ماں کے لئے ہے اور وہ پانی حرام نہیں ہوا بلکہ سارے مدینہ کے لوگوں نے اس سے

پانی پیا۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اس کھانے پر جب اللہ تعالیٰ کے پیارے نبیوں، ولیوں کا نام لے لیا جاتا ہے اور ان کا ذکر کر دیا جاتا ہے تو وہ کھانا اور برکت والا اور رحمتوں والا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے عِنْدَ ذِكْرِ الصَّالِحِيْنَ تَنَزَّلُ الرَّحْمَةُ کہ صالحین کے ذکر کے وقت رحمتوں کا نزول ہوتا ہے (صفۃ الصفوۃ یہ ابن جوزی) لہٰذا جس ولی کی فاتحہ ہے اس کا جب نام لیا جائے گا کہ مثلاً یہ کہا جائے گا کہ اس کا ثواب حضرت غوث پاک کو پہنچے، خواجہ نقشبند کو پہنچے، خواجہ معین الدین چشتی کو پہنچے، امام حسین کو پہنچے وغیرہ وغیرہ تو ان کے ناموں کی برکت سے رحمتوں کا نزول ہوگا اور وہ کھانا بھی رحمتوں والا اور برکتوں والا ہو جائے گا۔ بہرحال ثابت ہوا کہ بارھویں، گیارھویں، کونڈے، شب برات کے حلوے، تیجہ، چالیسواں، دسواں، بیسواں، چہلم، برسی و عرس وغیرہ یہ جائز ہیں اور مذکورہ بالا احادیث کی روشنی میں جو قرآن پاک، کلمہ، درود وغیرہ جو ان میں پڑھا جاتا ہے اور کھانا وغیرہ کھلا کر مردے کو اس کا ثواب پہنچایا جاتا ہے وہ برحق ہے اور اس پڑھنے کا اور کھانے کا ثواب مردے کو پہنچتا ہے اور اس کی مغفرت اور بلندی درجات اور فرحت و مسرت کا موجب بنتا ہے۔

چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ ہم اپنے مردوں کے لئے جو دعائیں کرتے ہیں ان کی طرف سے جو صدقات و خیرات اور حج وغیرہ کرتے ہیں کیا وہ ان کو پہنچتی ہیں......؟ حضور ﷺ نے فرمایا بے شک یہ چیزیں مردوں کو پہنچتی ہیں اور وہ ان سے خوش ہوتے ہیں جیسے تم ایک دوسرے کے ہدیہ اور تحفوں سے خوش ہوتے ہو۔ (مسند احمد)

جناب محمد قاسم نانوتوی (بانی مدرسہ دیوبند) نے تحذیر الناس میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مرید پریشان بیٹھا تھا اور غم و اندوہ سے اس کا رنگ متغیر ہو رہا تھا۔ حضرت جنید نے اس سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ میں نے کشف سے دیکھا ہے کہ میری ماں دوزخ میں ہے۔ حضرت جنید فرماتے ہیں میں نے سوچا کہ بعض

روایات میں آیا ہے کہ جس نے ایک لاکھ پانچ ہزار بار کلمہ پڑھا تو اس کی مغفرت کر دی جائے گی۔ میں نے اتنی مرتبہ کلمہ پڑھا ہوا ہے۔ چنانچہ یہ سوچ کر میں نے اس کا ثواب اس کی والدہ کو اسی وقت پہنچا دیا۔ تھوڑی دیر میں کیا دیکھتا ہوں کہ اس میرے مرید کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ آپ نے اس سے پوچھا تو اس نے کہا کہ اب میں اس کو جنت میں دیکھتا ہوں۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد سے مجھے یقین ہو گیا کہ یہ حدیث صحیح ہے اور اسے جو مغفرت کی بشارت دی گئی ہے وہ بھی بالکل درست اور برحق ہے (تحذیر الناس) اس سے معلوم ہوا کہ مردے کو ایک لاکھ پانچ ہزار کلمہ کا ثواب بخش دیا جائے تو اس کی بخشش ہو جاتی ہے۔ اس لئے تیجہ کے موقع پر مسلمانوں میں چنوں پر کلمہ پڑھنا رائج ہے تاکہ اس سے مردے کی بخشش کا سامان ہو جائے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ غوث پاک کی نیاز و امام حسین کی سبیل وغیرہ وغیرہ کیونکہ ان فاتحہ کے کھانوں پر غیر اللہ کا نام آ گیا اس لئے یہ کھانا حرام ہو گیا۔ کیونکہ قرآن میں ہے......

مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ...... اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں جو آیت مبارکہ آئی ہے وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ جانور جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لیا جائے اور اللہ اکبر کے بجائے غیر اللہ کے نام پر اس کو ذبح کیا جائے وہ حرام ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ محض کسی چیز پر غیر اللہ کے نام آنے سے وہ چیز حرام نہیں ہوتی۔ بلکہ صرف وہ جانور حرام ہوتا ہے جس کو ذبح کرتے وقت اس پر غیر اللہ کا نام لیا جائے۔ اس آیت کے یہ معنی کرنا کہ جس چیز پر غیر اللہ کا نام آ گیا وہ حرام ہو گئی۔ یہ معنی عقل ونقل کے بالکل خلاف ہیں۔ اس لئے کہ ابھی حدیث گزری کہ حضرت سعد نے کنویں پر اپنی ماں کا نام لیا لیکن وہ حرام نہیں ہوا۔ حضور ﷺ نے فرمایا سب روزوں سے زیادہ محبوب روزہ اللہ کو صیام داؤد یعنی حضرت داؤد علیہ السلام کا روزہ ہے۔ یہاں روزہ پر حضرت داؤد علیہ السلام کا نام آیا لیکن روزہ حرام نہیں ہوا۔ قرآن کی سورتوں کے اکثر نام غیر اللہ پر ہیں۔ مثلاً بقرہ، آل عمران، نساء، مائدہ، انعام وغیرہ لیکن غیر اللہ کے نام آنے سے سورتیں معاذ اللہ حرام نہیں ہو

جاتیں۔ مساجد پر غیر اللہ کا نام آتا ہے کہ مسجد نبوی، مسجد قبا، مسجد ابوبکر وغیرہ لیکن یہ مسجدیں حرام نہیں ہوتیں۔ عام طور پر چیزوں پر غیر اللہ کا نام آتا ہے کہ یہ زید کا مکان ہے، خالد کی دکان، بکر کا کھانا، انور کا بکرا، اختر کی روٹی، شیخ القرآن کی بیوی، مفکر اسلام کی زوجہ محترمہ لیکن ان میں سے کوئی بھی چیز حرام نہیں ہوتی۔ معلوم ہوا کہ یہ کہنا غلط ہے کہ جس پر غیر اللہ کا نام آجائے وہ حرام ہو جاتی ہے اور نہ ہی یہ آیت کا مفہوم ہے۔ لہٰذا فاتحہ کے وقت جس کے لئے فاتحہ دی جارہی ہے اس کا نام آجائے تو اس سے کھانا حرام نہیں ہو جاتا۔

☆☆

آیت نمبر (36)

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِيٓ أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ﴿٦٠﴾ (مومن)

''اور تمہارے رب نے فرمایا کہ مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا۔ بے شک وہ جو میری عبادت کرنے سے تکبر کرتے ہیں وہ عنقریب ذلیل وخوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے''۔

فائدہ

اس آیت مبارکہ میں مسلمانوں کو اپنے رب سے دعا مانگنے کا حکم دیا جارہا ہے کہ اس سے دعا مانگو وہ ضرور قبول فرمائے گا۔ لیکن اس آیت میں کوئی قید نہیں لگائی کہ فلاں وقت مانگو۔ اس سے ثابت ہوا کہ جس وقت بھی بندہ اپنے رب سے دعا مانگے گا، خواہ اذان کے بعد مانگے، خواہ نماز کے بعد، عام پنجگانہ نمازوں کے بعد مانگے یا نماز جنازہ کے بعد مانگے۔ الغرض جب بھی وہ دعا مانگے گا قرآن کی اس آیت پر عمل کر کے خدا کا قرب حاصل کر رہا ہو گا۔ بعض لوگ پنجگانہ نمازوں کے بعد اور نماز جنازہ ہو جانے کے بعد دعا مانگنے کو برا کہتے ہیں اور اس سے روکتے ہیں۔ حالانکہ نمازوں کے بعد دعا کرنیوالا کوئی غلط کام نہیں کر رہا بلکہ قرآن کی اس آیت پر عمل کر کے اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم کا مستحق بن رہا ہے۔ جب کہ

احادیث میں واضح طور پر اس کا ثبوت موجود ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سی دعا زیادہ قبول ہوتی ہے تو آپ نے فرمایا ایک تو آخر رات کے درمیانی حصہ میں جو دعا کی جائے وہ زیادہ قبول ہوتی ہے اور دوسری فرض نمازوں کے بعد جو دعا کی جائے وہ زیادہ قبول ہوتی ہے۔ (سنن ابوداؤد، سنن نسائی، مسند احمد، بیہقی، مشکوٰۃ باب الذکر بعد الصلوٰۃ) اس حدیث سے ثابت ہوا کہ فرض نمازوں کے بعد دعا کرنا مسنون ہے اور خود حضور ﷺ کے اس ارشاد سے ثابت ہے کہ اس وقت دعا زیادہ قبول ہوتی ہے۔ جب کہ حصن حصین میں اس حدیث کو ترمذی اور حاکم کے حوالے سے نقل کیا ہے اور اس میں......بسط الیدین......کے الفاظ کا اضافہ بھی ہے جبکہ......ورفعهما......کے الفاظ صحاح ستہ کے حوالے سے مذکور ہیں۔ جس کے معنی ہیں ہاتھ پھیلانا اور بلند کرنا۔ اس سے ثابت ہوا کہ فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا مسنون ہے۔ بہر حال نماز پنجگانہ کے بعد دعا کرنا بدعت نہیں جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے۔ بلکہ قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔

☆ اسی طرح آیت سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ نماز جنازہ کے بعد بھی دعا کرنا درست ہے۔ کیونکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے دعا کے لئے کوئی قید نہیں لگائی۔ لہٰذا جو نماز جنازہ کے بعد دعا کرے گا وہ بھی قرآن پر عمل کر رہا ہے بلکہ مندرجہ بالا حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ فرض نمازوں کے بعد دعا زیادہ قبول ہوتی ہے۔ جب کہ نماز جنازہ بھی فرض ہے لہٰذا اس حدیث کی رو سے ثابت ہوا کہ نماز جنازہ کے بعد دعا کرنی چاہئے کہ اس وقت بھی دعا زیادہ قبول ہوتی ہے جب کہ ایک اور حدیث مبارک میں سرکار کا ارشاد گرامی ہے کہ جب تم میت پر نماز پڑھ چکو تو اس کے لئے خالص دعا مانگو (مشکوٰۃ باب صلوٰۃ الجنازہ) اس حدیث میں واضح طور سے نماز جنازہ کے بعد دعا مانگنے کا حکم دیا جا رہا ہے اسی مشکوٰۃ شریف میں ایک اور حدیث مبارک ہے کہ حضور ﷺ نے جنازہ پر سورہ فاتحہ پڑھی۔ اس کی تشریح اور تفسیر بیان کرتے ہوئے شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمت اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اس

کے معنی یہ ہیں کہ نماز جنازہ کے بعد آپ نے سورہ فاتحہ پڑھی جیسا کہ آج کل رواج ہے (اشعۃ اللمعات) اس سے معلوم ہوا کہ نماز جنازہ کے بعد میت کے لئے سورہ فاتحہ وغیرہ پڑھ کر دعا کرنا اس زمانہ میں بھی رائج تھا اور شیخ محقق نے اس کو منع نہیں فرمایا۔ کیونکہ ان کی نظر میں یہ حدیث سے ثابت تھا۔ بیہقی شریف میں آتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک جنازہ پر نماز پڑھنے کے بعد اس کے لئے دعا کی۔ فتح القدیر میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت جعفر ابن ابی طالب کی نماز جنازہ پڑھی اور ان کے لئے دعا فرمائی اور لوگوں سے فرمایا تم بھی ان کے لئے دعائے مغفرت کرو۔ اس حدیث میں ''واوٗ'' آیا جو مغائرت کو چاہتا ہے۔ معلوم ہوا جس دعا کا حضور ﷺ نے لوگوں کو حکم دیا یہ نماز جنازہ کی دعا کے علاوہ اس کے بعد والی دعا تھی۔ بہر حال ثابت ہوا کہ نماز جنازہ کے بعد دعا کرنا قرآن اور احادیث سے ثابت ہے اور یہ بدعت نہیں بلکہ مسنون ہے۔

☆ حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق ہر دعا عبادت ہے۔......الدعاء ھو العبادۃ ......جو لوگ دعا کرنے کو برا سمجھتے ہیں اور بطور تکبر اس سے لوگوں کو روکتے ہیں اور منع کرتے ہیں ان کا انجام اسی آیت میں بیان کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو لوگ میری عبادت یعنی دعا سے تکبر کرتے ہیں وہ عنقریب ذلیل و رسواء ہو کر جہنم میں داخل کئے جائیں گے۔ لہٰذا اس وعید سے ڈرنا چاہئے۔ دعا خواہ فرض نمازوں کے بعد مانگی جائے یا نماز جنازہ اور نماز جمعہ یا نماز عیدین کے بعد، ہر حال میں کسی دعا سے روکنا نہیں چاہئے اور نہ اس کو برا کہنا چاہئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس وعید میں آ کر دنیا و آخرت میں تباہ و برباد ہو جائیں۔

آیت نمبر (37)

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ (بقرہ:158)

بے شک صفا اور مروہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہیں۔

فائدہ

صفا اور مروہ دو پہاڑیاں ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی ایک ولیہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہ

دوڑی تھیں۔ ان کے قدم ان پہاڑوں کو لگ گئے تو یہ پہاڑیاں متبرک ہو گئیں اور اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کو اپنی نشانی فرمادیا اور دوسری آیت میں اپنی نشانیوں کی تعظیم کی اہمیت اور افادیت بیان کرتے ہوئے فرمایا...... وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ...... کہ ہماری نشانیوں کی تعظیم کرنا دلوں کے تقوے کی علامت ہے۔ ان آیات نے ہمیں سبق دیا کہ جب کسی جگہ پر اللہ تعالیٰ کے ولیوں کے قدم لگ جائیں تو وہ جگہ شعائر اللہ میں سے بن کر لائق تعظیم ہو جاتی ہے تو پھر جن قبروں میں اللہ کے ولی خود آرام فرما ہوں ان کا پورا جسم انور قیامت تک کے لئے موجود ہو وہ قبریں اور مزارت کیوں نہ شعائر اللہ ہوں گے......؟ اور ان کی تعظیم کیوں نہ ضروری ہوگی۔ اس لئے تفسیر روح البیان میں...... وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ...... کے تحت لکھا ہے کہ انبیاء اور اولیاء کی قبریں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں اور شعائر اللہ میں سے ہیں۔ لہٰذا ان کی تعظیم اور احترام ضروری ہے۔

اب تعظیم مختلف طریقوں سے کی جاتی ہے۔ اس مزار پر چادر ڈالنا یہ بھی اس کی تعظیم ہے۔ اس پر پھول ڈالنا، وہاں آنے جانے والوں کی آسانی کے لئے بجلی کا اہتمام کرنا، وہاں زائرین کی سہولت کے لئے اس مزار پر کوئی عمارت گنبد وغیرہ بنا دینا۔ یہ سب تعظیم میں شامل ہیں اور چونکہ شعائر اللہ کی تعظیم کا حکم قرآن دیتا ہے۔ لہٰذا ان شعائر اللہ یعنی قبروں کی تعظیم کی خاطر ان پر گنبد وغیرہ بنانا، ان مزارات پر پھول اور چادریں وغیرہ ڈال کر ان کی عظمت اور احترام کو آشکارا کرنا نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہوگا اور قرآن کے ارشاد کے مطابق دلوں کے تقوے کی علامت ہوگا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ مزارات پر گنبد وغیرہ یا کوئی عمارت بنانا یا مزار کو پکا بنانا جائز نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضور ﷺ کا مزار مبارک پکا بنا ہوا ہے اور اس پر سبز گنبد اور پوری عمارت شروع سے آج تک موجود ہے۔ اس کے علاوہ مختلف ملکوں میں ہزاروں بلکہ لاکھوں صحابہ، تابعین، تبع تابعین، ائمہ مجتہدین اور صالحین کے مزارات پر گنبد وغیرہ بنے ہوئے ہیں اور چادریں پڑی ہوئی ہیں۔ اگر یہ حرام اور ناجائز ہوتے تو ان کو کبھی کا ختم کر دیا

گیا ہوتا، لیکن ہر دور میں ان کا اسی طرح موجود رہنا دلیل ہے کہ یہ جائز ہے۔ حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتقال ہوا تو ان کی زوجہ محترمہ نے ایک سال تک ان کے مزار پر قبہ بنائے رکھا۔ اس وقت موجود تمام صحابہ اور تابعین نے دیکھا لیکن کسی نے منع نہیں کیا۔ معلوم ہوا کہ مزار پر قبہ اور گنبد وغیرہ بنانا حرام نہیں۔ (بخاری کتاب الجنائز مشکوٰۃ باب البکاء علی المیت) اسی لئے احناف کے بڑے بڑے ائمہ مثلاً علامہ ملا علی قاری رحمت اللہ تعالیٰ علیہ، صاحب طحطاوی رحمت اللہ تعالیٰ علیہ اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمت اللہ تعالیٰ علیہ وغیرہ نے مزارات اولیاء پر ان کی عظمت کے اظہار کے لئے قبے اور گنبد وغیرہ بنانے کو جائز لکھا۔ (روح البیان، مرقاۃ، اشعہ اللمعات، طحطاوی ص 335)

☆ جن احادیث میں قبر کو پکا کرنے اور اس پر عمارت اور گنبد وغیرہ بنانے کی ممانعت آئی ہے اس سے مراد یا تو عام مسلمانوں کی قبریں ہیں کہ ان کے لئے اتنے اہتمام کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ وہ شعائر اللہ میں سے نہیں لہٰذا ان کی تعظیم ان پر گنبد وغیرہ بنا کے ان کی تعظیم واحترام ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں یا قبر کے بالکل اوپر دیوار وغیرہ بنانے کی ممانعت مراد ہوگی نہ کہ قبر کے اردگرد عمارت کی ممانعت ہوگی۔ کیونکہ اگر اس سے قبر کے اردگرد عمارت اور گنبد بنانے کی مخالفت مراد ہو تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ صحابہ کرام حضور ﷺ کے اس قول کی ممانعت کرتے ہوئے قبے اور گنبد بناتے۔ جب کہ روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زینب بنت جحش کی قبر پر قبہ بنایا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بھائی حضرت عبدالرحمٰن کی قبر پر قبہ بنایا۔ حضرت علی کے پوتے حضرت محمد بن حنفیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قبر پر قبہ بنایا۔ (منتقا شرح موطا، بدائع الصنائع جلد اول ص 320/ عینی شرح بخاری) لہٰذا ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کی قبروں کے اردگرد قبہ بنانا جائز ہے اور صحابہ کی سنت ہے۔

☆ اسی طرح غلاف اور چادر ڈالنا کیونکہ اس سے اس ولی کے مزار کی تعظیم کا اظہار مقصود ہے۔ لہٰذا یہ بھی جائز ہے جیسے حضور ﷺ کے زمانہ سے لے کر آج تک خانہ کعبہ کو

غلاف چڑھایا جاتا ہے۔اس کی تعظیم کی خاطر اسی طرح حضور ﷺ کے روضہ انور پر سبز غلاف ہمیشہ سے چڑھایا جاتا رہا ہے اور آج تک چڑھا ہوا ہے۔ مصر وغیرہ میں بہت سے صحابہ اور اولیاء کے مزارات پر غلاف اور چادریں چڑھی ہوئی ہیں۔لیکن آج تک کسی نے منع نہیں کیا۔اسی لئے فقہ حنفی کی معتبر کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ اولیاء کی تعظیم کی نیت سے ایسا کرنا جائز ہے۔(شامی جلد 5 کتاب الکراہت باب اللباس)

☆ البتہ جن احادیث میں مٹی اور پتھروں کو کپڑے پہنانے کی ممانعت آئی ہے اس سے مراد عام گھروں میں بغیر کسی ضرورت کے پردے لٹکانا مراد ہے۔کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دیوار پر پردے ڈالے تھے تو اس کے متعلق سرکار نے فرمایا تھا کہ رب نے ہمیں حکم نہیں دیا کہ ہم مٹی اور پتھروں کو کپڑے پہنائیں۔ اس کا قبروں کے غلاف اور چادروں سے کوئی تعلق نہیں۔

اسی طرح جن احادیث میں قبروں پر چراغ جلانے کی ممانعت آئی ہے اس سے مراد بے فائدہ اور بلا ضرورت چراغ جلانا ہے کہ یہ مال کا ضائع کرنا اور اسراف ہے۔ اس لئے ناجائز ہے۔لیکن اگر کسی ضرورت کے لئے ہو یعنی اولیاء کی عظمت کو آشکارا کرنے کے لئے ہو تو پھر چراغ اور بلب وغیرہ جلانا جائز ہے۔

☆☆

آیت نمبر (38)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ

اے ایمان والو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور جو صاحب امر ہوں ان کی بھی اطاعت کرو۔(النساء:59)

فائدہ

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اور اپنے محبوب کی اطاعت کے علاوہ اُولِی الْاَمْرِ یعنی صاحب امر لوگوں کی اطاعت اور ان کی تقلید کا حکم دیا۔اب سوال یہ ہے کہ صاحب امر

سے کون لوگ مراد ہیں......؟ تو اس کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت ابن عباس حضرت جابر بن عبداللہ حضرت عطاء بن ابی رباح جیسے صحابہ اور تابعین فرماتے ہیں اس سے اہل علم اور اہل فقہ مراد ہیں جب کہ حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ اس سے مسلمان حکام اور امراء مراد ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں دونوں تفسیروں میں کوئی تعارض نہیں۔ لہٰذا دونوں معنی یہاں مراد ہیں اور آیت میں حکم دیا جارہا ہے کہ مسلمان حکمرانوں کی بھی اطاعت کرو اور علماء اور اہل فقہ کی بھی اطاعت اور تقلید کرو۔ (مستدرک، حاکم ج 1 ص 123 ۃ دارمی ص 40/ احکام القرآن 2/ ص 210/ تفسیر روح المعانی 5 ص 65/ تفسیر ابن کثیر 2 ص 497)

لہٰذا حنفی حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کی اطاعت اور تقلید کرتے ہیں جب کہ شوافع حضرت امام شافعی کی، حنبلی حضرت امام احمد بن حنبل کی، مالکی حضرت امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم کی فقہی مسائل میں جو اطاعت اور تقلید کرتے ہیں وہ شرک و بدعت نہیں۔ بلکہ اس آیت پر عمل کررہے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور دوسری آیات میں بھی اللہ تعالیٰ نے اہل علم اہل فقہ کی طرف رجوع کرنے اور ان سے مسئلے پوچھنے اور ان کے پیچھے چلنے اور ان کا اتباع اور تقلید کرنے کا ہمیں حکم دیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے...... فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ ...... ”تو تم اہل علم سے پوچھ لو اگر خود نہیں جانتے“ (النحل:14) اور جب پوچھو تو ایک مقام پر فرمایا کہ پھر ان کا اتباع کرو...... وَّاتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ...... ”جو لوگ میری طرف رجوع کرتے ہیں ان کے راستے کی اتباع کرو“ (لقمان:21) ظاہر ہے کہ یہ چاروں ائمہ زبردست اہل علم اور اہل عرفان میں سے تھے۔ نہ صرف یہ کہ ظاہری عالم تھے بلکہ عارف کامل اور اللہ کی طرف رجوع کرنے والے عابد و زاہد بھی تھے۔ لہٰذا ان آیات کی رو سے ان سے مسائل میں رجوع کرنا اور پھر ان کا اتباع کرنا یہ قرآن کے ارشاد کے مطابق ہے۔ حضور ﷺ نے خود اپنے صحابہ کرام کی سنت کو مضبوطی سے پکڑنے اور اس پر عمل کرنے کا حکم دیا۔ (ترمذی 2 ص 92/ ابن ماجہ ص 5/ ابوداؤد 279/2) اگر حضور ﷺ کے علاوہ کسی اور کا اتباع اور تقلید حرام اور ناجائز ہوتی تو حضور ﷺ اپنے صحابہ کی

تقلید کرنے کا کیوں حکم دیتے۔ عقل بھی کہتی ہے کہ دنیا میں کوئی کام بغیر تقلید اور اتباع کے نہیں ہوتا۔ آدمی علم سیکھتا ہے کسی استاد کی اتباع کرکے۔ کوئی ہنر سیکھتا ہے کسی ہنر مند کی اتباع اور پیروی کرکے۔ نماز پڑھتے ہیں کسی امام کی اتباع میں اور قیام رکوع وسجود میں اس کی تقلید کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت میں رعایا اپنے حکمرانوں کے افعال کی تقلید کرتی ہے۔ سارا نظام ہی تقلید سے چل رہا ہے۔ اگر یہ حرام اور ناجائز ہو تو پھر تو ان میں سے کوئی کام جائز نہیں رہے گا سب حرام ہو جائیں گے۔ بعض قرآنی آیات ایسی ہیں جن میں تقلید اور اتباع کی ممانعت اور برائی بیان کی گئی۔ مثلاً فرمایا وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا اور ان کی اطاعت نہ کرو جن کا قلب ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا۔ (سورہ کہف آیت 28) وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ الخ یہ کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے تو اس پر چلو اور راستوں پر نہ چلو کہ تم کو اس کی راہ سے جدا کر دے گی (سورۃ انعام ص 153) اس قسم کی تمام آیات میں خلاف شرع تقلید اور خلاف اسلام راستے مراد ہیں کہ ایسے راستوں پر چلنا اور ایسے لوگوں کی اطاعت اور تقلید حرام ہے۔ جب کہ اہل علم فقہاء اور محدثین ومجتہدین کی تقلید کا جائز ہونا بلکہ ان کے اتباع کا حکم اوپر ذکر کی گئی بہت سی آیات سے ثابت ہو چکا ہے۔

بہر حال خلاصہ یہ ہے کہ اصول عقائد مثلاً توحید ورسالت آخرت وغیرہ پر ایمان، اسی طرح صریح احکام مثلاً نماز روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ جن کا ثبوت قرآن وحدیث سے صراحتاً ثابت ہے اس میں تو ہم کسی کے مقلد نہیں۔ البتہ وہ مسائل جو صریح نہیں ہیں بلکہ قرآن وحدیث سے استنباط اور اجتہاد کرکے نکالے جاتے ہیں۔ اس میں ہم پر کسی نہ کسی امام کی تقلید کرنا واجب ہے۔ چاروں امام امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام مالک یہ سب برحق ہیں۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے جس کی بھی ان اجتہادی مسائل میں اتباع اور تقلید کرلی تو وہ بری ہو گیا اور قرآن کے حکم پر عمل پیرا ہونے والا کہلائے گا اور اللہ کے یہاں اس کی کوئی پکڑ نہیں ہوگی۔

آیت نمبر (39)

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿٢٠٤﴾

اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو اور خاموش رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔ (الاعراف)

فائدہ

اس آیت مبارکہ میں قرآن کی تلاوت کے وقت خاموش رہنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔ جب کہ حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباس جیسے جلیل القدر مفسر صحابہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت فرض نمازوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ امام کے پیچھے جب فرض نمازیں پڑھو تو اس کے پیچھے کچھ نہ پڑھو بلکہ خاموش کھڑے رہو۔ (تفسیر ابن جریر 103/9/ تفسیر ابن کثیر 28/2) بلکہ حضرت ابن مسعود اور مقداد بن اسود تو ان لوگوں کو ڈانٹا کرتے تھے جو امام کے پیچھے سورہ فاتحہ وغیرہ پڑھتے تھے (تفسیر مظہری 507/3/ تفسیر ابن کثیر 103/6) حضرت امام احمد بن حنبل تو فرماتے ہیں کہ اس پر اجماع ہو چکا ہے کہ یہ آیت نمازوں کے متعلق ہے اور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ جب امام زور سے قرات کر رہا ہو تو اس وقت مقتدی پر قرات کرنا اور کچھ پڑھنا واجب نہیں (فتاوئی ابن تیمیہ 168/2) بہر حال اس آیت سے ثابت ہو گیا کہ فرض نمازیں جب جماعت سے پڑھی جائیں تو اس وقت امام کے پیچھے سورہ فاتحہ یا کسی بھی سورت کی تلاوت نہیں کرنی چاہئے بلکہ خاموش کھڑا رہنا چاہئے۔

احادیث سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا جو شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کی قرات مقتدی کی بھی قرأت شمار ہو گی اس کو علیحدہ قرأت کرنے کی ضرورت نہیں۔ (ابن ماجہ ص 61) بلکہ ایک دفعہ جب حضور ﷺ نماز پڑھا کے فارغ ہوئے تو آپ نے ڈانٹتے ہوئے فرمایا کہ تم لوگوں نے میرے پیچھے قرات کر کے مجھ پر قرآن خلط ملط کر دیا (طحاوی ص 106) دوسری روایات میں آتا ہے کہ اس کے بعد صحابہ کرام

حضور ﷺ کے پیچھے نماز میں قرات کرنے سے رک گئے پھر انہوں نے قرات نہیں کی (موطا امام مالک ص 29/ نسائی ص 106/ ابوداؤد جلد ایک ص 121/ ترمذی ص 42/ ابن ماجہ ص 61) حضرت عطاء بن یسار فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت زید بن ثابت سے امام کے پیچھے پڑھنے کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ کسی بھی نماز میں (یعنی خواہ جہری ہو یا سری) کوئی قرات نہیں کی جا سکتی (مسلم جلد اول ص 215/ نسائی جلد اول ص 111/ طحاوی ص 108/ مصنف عبدالرزاق 2/ ص 138) حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ نے تو یہاں تک فرمادیا کہ جو امام کے پیچھے پڑھے اس کے منہ میں انگارے بھرے جائیں۔ (موطا امام محمد ص 98/ مصنف ابن ابی شیبہ 1، 372) حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت زید بن ثابت اور حضرت جابر بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ کسی نماز میں بھی (خواہ وہ جہری ہو یا سری) امام کے پیچھے قرات نہیں کرنی چاہیئے۔ (طحاوی ص 107) اسی لئے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت علقمہ بن انس امام کے پیچھے سری اور جہری کسی نماز میں بھی قرات نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا ہمارا مسلک یہی ہے کہ کسی نماز میں بھی امام کے پیچھے سورہ فاتحہ یا کوئی صورت نہیں پڑھنی چاہیئے۔ (کتاب الاثار لامام محمد ص 164)

☆ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ امام کے پیچھے بھی سورۂ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے ورنہ نماز نہیں ہوتی۔ کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں۔ لیکن ان کا یہ کہنا غلط ہے کیونکہ حضور ﷺ کا یہ ارشاد کہ سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی یہ اس شخص کے لئے ہے جو اکیلے نماز پڑھ رہا ہو۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر نے اس کی تفصیل بیان فرمائی۔ (موطا امام مالک ص 29/ طحاوی ص 129/ موطا امام محمد ص 42) یہ حضور ﷺ کا ارشاد جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے والے مقتدی کے لئے نہیں۔ ورنہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ادھر تو حضور سرور عالم ﷺ سورہ فاتحہ امام کے پیچھے پڑھنے کو ضروری اور فرض قرار دیں اور دوسری حدیث میں مقتدیوں کو سورہ فاتحہ پڑھنے پر ناراضگی کا اظہار فرمائیں اور فرمائیں کہ تم نے مجھ پر قرآن خلط ملط کر دیا۔ اگر یہ فرض ہوتا تو اتنے سارے جلیل القدر صحابی اس کو کیسے

چھوڑتے اور اس کے پڑھنے والے کے لئے منہ میں پتھر اور انگارے بھرنے جیسے الفاظ کیسے استعمال کرتے۔ معلوم ہوا کہ جس حدیث میں سورہ فاتحہ پڑھنا ضروری قرار دیا گیا ہے وہ منفرد یعنی اکیلے نماز پڑھنے والے کے لئے ہے اور جس میں منع کیا گیا ہے وہ جماعت سے امام کے پیچھے نماز پڑھنے والے مقتدی کے لئے ممانعت ہے۔ اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ ایک روز جب حضور ﷺ رکوع میں چلے گئے تو حضرت ابوبکر رکوع میں آ کر حضور ﷺ سے مل گئے، لیکن حضور ﷺ نے ان کو دوبارہ نماز لوٹانے کا حکم نہیں دیا۔ (سنن کبریٰ جلد اول ص 90) حالانکہ اگر سورہ فاتحہ پڑھنا مقتدی کو فرض اور ضروری ہوتا تو حضرت ابوبکر نے بھی سورہ فاتحہ نہیں پڑھی تھی۔ بغیر پڑھے رکوع میں مل گئے۔ ان کی نماز نہیں ہونی چاہئے تھی لیکن حضور ﷺ نے ان کو نماز لوٹانے کا حکم نہیں دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مقتدی کا امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنا ضروری نہیں۔

☆☆

آیت نمبر (40)

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝

"اور دعا کرو اپنے رب سے گڑگڑا کر اور خفیہ (آہستہ خاموشی سے) بے شک اللہ تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا"۔ (الاعراف)

فائدہ

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں دعا آہستہ خفیہ یعنی خاموشی سے مانگنے کا حکم دیا ہے اور زیادہ بلند آواز سے دعا کرنے پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے۔ جب کہ آمین کہنا یہ بھی ایک دعا ہے۔ کیونکہ اس کے معنی ہیں (اے اللہ قبول فرما) جب کہ حضرت عطاء بھی فرماتے ہیں کہ آمین ایک دعا ہے (صحیح بخاری ص 107) لہٰذا اس آیت کی رو سے ثابت ہوا کہ نماز میں جب امام وَلَا الضَّآلِّيْنَ کہتا ہے تو مقتدیوں کو آمین آہستہ اور خاموشی سے کہنا چاہئے۔ کیونکہ یہ دعائیہ کلمہ ہے اور مذکورہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ آہستہ دعا کرنے کا حکم دے

رہا ہے اور بہت زیادہ بلند آواز سے دعا کرنے والوں سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار فرما رہا ہے۔ لہٰذا زور سے آمین نہیں کہنا چاہیے بلکہ قرآن پر عمل کرتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور پسندیدگی کا خیال رکھتے ہوئے آمین آہستہ کہنی چاہیے۔ جب کہ احادیث نبوی کی رو سے آہستہ سے آمین کہنے کا ایک عظیم فائدہ یہ بھی ہے کہ آہستہ آمین کہنے والے کے پچھلے سارے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔ کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جب امام وَلَا الضَّآلِّيْنَ کہے تو تم آمین کہا کرو پس جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہوگئی۔ اس کے پچھلے سارے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ (صحیح بخاری جلد اول ص 108/ ابوداؤد جلد اول ص 94/ نسائی جلد اول ص 94) ظاہر ہے فرشتے آمین آہستہ ہی کہتے ہیں۔ کیونکہ ہم نے ان کی آمین آج تک نہیں سنی۔ لہٰذا حضور ﷺ کے اس ارشاد کے مطابق جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق آہستہ ہوگی اس کے لئے یہ خوشخبری ہے کہ اس کے سارے پچھلے گناہ بخش دیئے جائیں گے اور جو زور سے آمین کہتے ہیں ان کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق نہیں۔ لہٰذا وہ اس عظیم خوشخبری سے محروم رہیں گے اور مندرجہ بالا آیت مبارکہ پر عمل نہ کرنے کی برائی علیحدہ اپنے سر لیں گے۔ جب کہ دیگر احادیث میں وضاحت کے ساتھ آنحضرت ﷺ کا عمل اور طریقہ بھی اسی طرح بتایا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت وائل بن حجر فرماتے ہیں کہ میں نے سنا کہ جب حضور ﷺ نے وَلَا الضَّآلِّيْنَ کہا تو پست اور ہلکی آواز میں آمین کہا۔ (مصنف ابن ابی شیبہ/ مسند احمد/ ابوداؤد/ دار قطنی/ حاکم/ ابو یعلی) اسی طرح صحابہ کرام سے بھی یہی طریقہ منقول ہے۔ چنانچہ حضرت حسن فرماتے ہیں کہ حضرت سمرہ بن جندب جب بھی نماز پڑھاتے تھے تو دو سکتے (خاموشی، سکوت) فرمایا کرتے تھے۔ ایک نماز شروع کرتے ہی (نماز پڑھنے کے وقت) اور دوسرا وَلَا الضَّآلِّيْنَ کے بعد۔ حضرت ابی بن کعب نے بھی اس کی تصدیق کی (مسند احمد، دار قطنی) حضرت وائل فرماتے ہیں کہ حضرت علی اور حضرت عبداللہ ابن مسعود نماز میں بسم اللہ، اعوذ باللہ اور آمین بلند آواز سے نہیں کہتے تھے۔ (مجمع الزوائد جلد اول ص 185)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ نماز با جماعت کے اندر آہستہ آواز سے آمین کہنے والا خود حضور ﷺ کی اور آپ کے صحابہ کی سنت پر عمل کرنے کا ثواب بھی حاصل کر رہا ہے...... اس کے علاوہ اکادکا وہ احادیث جن میں حضور ﷺ کے بلند آواز سے آمین کہنے کا ذکر ملتا ہے اول تو ان میں سے اکثر صحیح احادیث نہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ وہ آپ نے نو مسلموں کے سکھانے کے لئے ایک دو دفعہ بلند آواز سے فرما دیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے کبھی آپ نے سکھانے کے لئے ظہر کی نماز میں بلند آواز سے تلاوت کر لی تو جس طرح ایک دو مرتبہ سکھانے کی غرض سے ظہر کی نماز میں تلاوت فرمانے پر وہ تلاوت سنت مؤکدہ نہیں ہو جاتی اسی طرح سکھانے کے لئے ایک دو دفعہ آمین کہنے سے وہ سنت مؤکدہ نہیں بن جائے گی۔ چنانچہ حضرت وائل فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے آمین بلند آواز سے صرف تین مرتبہ کہی (طبرانی فی الکبیر / مجمع الزوائد ص 187) جب کہ آخر عمر تک حضور ﷺ کا اور آپ کے صحابہ کا آمین بلند آواز سے کہنا یہ کسی حدیث سے ثابت نہیں اور جس حدیث میں حضرت ابن زبیر اور ان کے مقتدیوں کے بلند آواز سے آمین کہنے اور مسجد میں گونج پیدا ہونے کا ذکر ہے۔ اول تو وہ حدیث بلا سند ہے......! دوسرا یہ کہ وہ ایک اور حدیث کے متعارض ہے جس میں یہ آتا ہے کہ حضرت ابن زبیر آمین نہیں کہتے تھے (طحاوی جلد اول ص 120) لہٰذا یہ حدیث قابل عمل نہیں اذا تعارضا تساقطا۔

☆☆

آیت نمبر (41)

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ (المومنون)

بے شک کامیاب ہو گئے وہ مومن جو اپنی نمازوں میں خشوع کرتے ہیں۔

فائدہ

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ان مومنوں کو جو اپنی نمازوں میں خشوع کرتے ہیں کامیابی کی بشارت دی ہے۔ خشوع کسے کہتے ہیں......؟ تو علمائے کرام فرماتے ہیں کہ

''خشوع'' دل کا بھی فعل ہے اور بدن کا بھی۔ اگر دل سے ہو تو اس کے معنی ہیں اللہ کا خوف اور حضور قلب اور جب جسم کا فعل ہو تو اس کے معنی ہوں گے سکون و طمانیت (فتح الباری شرح بخاری لابن حجر عسقلانی) اب اس آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ جو مومن اس طرح نماز پڑھتے ہیں کہ دل میں بھی ان کے خشیت الٰہی ہوتی ہے اور جسم بھی ان کا پر سکون ہوتا ہے۔ یعنی رکوع اور سجدہ وغیرہ کے وقت بار بار ہاتھ اٹھا کر رفع یدین کر کے نماز کے اندر طمانیت اور سکون کو ختم نہیں کرتے۔ ایسے لوگ کامیاب اور کامران ہیں۔ مفسروں کے سردار اور جلیل القدر صحابی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بھی اس آیت میں خٰشِعُوْنَ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ نمازوں میں رفع یدین نہیں کرتے بلکہ نماز کو طمانیت اور سکون کے ساتھ پڑھتے ہیں وہ کامیاب ہیں۔ (تفسیر ابن عباس ص 323)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بھی معمول یہی تھا۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز کی پہلی تکبیر کے علاوہ پوری نماز میں کہیں بھی رفع یدین نہیں فرمایا (دار قطنی فی العلل بحوالہ حاشیہ دار یہ ص 415) حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے بھی اسی قسم کا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول منقول ہے۔ (ابوداؤد جلد اول ص 72، طحاوی جلد اول ص 132/ دار قطنی جلد اول ص 111/ مصنف ابن ابی شیبہ جلد اول ص 121/ مصنف عبدالرزاق) یہ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل تھا۔ جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رفع یدین کے بارے میں بڑی سختی کے ساتھ صحابہ کو منع فرمایا۔ چنانچہ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے ہم اس وقت نماز پڑھ رہے تھے اور نماز کے اندر رفع یدین کر رہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں رفع یدین کرتا دیکھ کر بڑی ناراضگی سے فرمایا تم نماز میں شریر گھوڑوں کی دم کی طرح کیا یہ ہاتھ اٹھاتے رہتے ہو۔ نماز میں سکون اور اطمینان سے رہا کرو۔ (صحیح مسلم جلد اول ص 181/ ابوداؤد جلد اول ص 150/ نسائی ص 172/ طحاوی جلد اول ص 158/ مسند احمد جلد 5 ص 93) اس حدیث میں نہ صرف کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رفع یدین سے منع فرمایا بلکہ جانوروں کے فعل کے ساتھ اس کو تشبیہ دے کر اس کی کراہت اور اس سے

اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بھی فرمادیا۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ حدیث صرف سلام کے وقت جو صحابہ رفع یدین کرتے تھے ان کی ممانعت میں آئی ہے بلکہ وہ حدیث علیحدہ ہے۔ اس حدیث کا تعلق نماز کے اندر رکوع و سجود وغیرہ کے وقت رفع یدین کرنے کی ممانعت سے ہے۔ کیونکہ سلام کے وقت جو رفع یدین ہوگا وہ تو نماز سے باہر ہوگا۔ جب کہ اس حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ "میں تم کو نماز میں رفع یدین کرتا دیکھتا ہوں نماز میں پرسکون رہا کرو" اس سے معلوم ہوا کہ یہ ممانعت رکوع و سجود وغیرہ کے وقت نماز کے اندر جو رفع یدین ہوتا ہے اس سے کی جارہی ہے نہ کہ سلام کے وقت نماز سے باہر جو رفع یدین ہوتا ہے اس سے۔ اس کی ممانعت کے لئے دوسری حدیث ہے۔ جب کہ اس واقعہ اور حدیث کے سلسلہ میں بعض روایات کے اندر صراحتاً موجود ہے کہ صحابہ رکوع میں جاتے اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین کر رہے تھے تو اس کو دیکھ کر سرکار نے ان کو منع فرمایا اور مندرجہ بالا ارشاد فرمایا (نہایہ) پھر چونکہ اس حدیث میں ہاتھ اٹھانے کے الفاظ عام ہیں جو رکوع و سجود اور سلام وغیرہ سب کو شامل ہیں۔ لہٰذا عمومیت الفاظ کا لحاظ کرتے ہوئے ہر قسم کا رفع یدین اوران سب مواقع پر رفع یدین کی اس سے ممانعت ثابت ہوجائے گی۔ خلفائے راشدین اور جلیل القدر صحابہ کا بھی یہی معمول رہا ہے کہ انہوں نے تکبیر تحریمہ کے علاوہ نماز میں کہیں بھی رفع یدین نہیں فرمایا۔ (ترمذی جلد اول ص 35) اس روایت کے سب راوی صحیح مسلم کے راوی ہیں اور ترمذی نے اس کو حسن کہا ہے اور لکھا ہے کہ بہت سے اہل علم صحابہ تابعین سفیان ثوری اور اہل کوفہ کا یہی مذہب ہے کہ رفع یدین نہیں کرنا چاہئے۔ امام مالک جو مدینہ میں عمر بھر رہے۔ وہ فرماتے ہیں میں نے عمر بھر کسی کو رفع یدین کرتے نہیں دیکھا (المدونہ الکبریٰ ص 71) بہرحال قرآن و حدیث سے ثابت ہوگیا کہ رفع یدین کرنا نماز میں درست نہیں۔ رفع یدین کے متعلق جو بعض روایات آئی ہیں اول تو ان میں سے اکثر ضعیف ہیں۔ بعض ایسی ہیں جس میں ہر تکبیر کے وقت رفع یدین کا ذکر ہے جب کہ سجدہ کی اور دوسری اور چوتھی رکعت کی تکبیر میں رفع یدین کا کوئی بھی قائل نہیں۔ جب کہ رفع یدین کے حق میں حضور

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی قول وحکم اور ارشاد موجود نہیں۔ اگر کسی حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمل کا ذکر ہے تو اسی طرح ہمیشہ کرتے رہنے کا ذکر نہیں۔ جب کہ ایک یا دو بار کوئی کام حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمالیں تو اس سے سنت ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک روز کھڑے ہوکر پیشاب فرمایا تو کیا کھڑے ہوکر پیشاب کرنا سنت ومستحب ہوگیا......؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بچی کو اٹھا کر نماز ادا فرمائی تو کیا یہ سنت اور مستحب ہوگیا......؟ ہرگز نہیں۔ لہٰذا ایک یا دو بار اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ فعل ثابت بھی ہو جائے تو اس سے اس کا سنت اور مستحب ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ ورنہ خلفائے راشدین اور صحابہ کرام اس سنت پر ضرور عمل کرتے۔ ان کا عمل نہ کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس قسم کی احادیث جن میں رفع یدین کا ذکر ہے وہ ابتدائے اسلام کا زمانہ ہے۔ بعد میں یہ کام ترک ہوگیا تھا بعد میں صحابہ کرام کی اکثریت اس کو سنت نہیں سمجھتی تھی۔ ورنہ وہ اس کو کبھی ترک نہ کرتے۔ بالخصوص وہ صحابی جو خود رفع یدین کی حدیث روایت کر رہے ہیں اور وہ خود رفع یدین نہیں کر رہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ کام پہلے ہوتا تھا بعد میں منسوخ ہوگیا اور آخر میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے نہیں کیا پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ رفع یدین چھوڑنے کی احادیث کے جو راوی ہیں وہ سب فقیہ ہیں جب کہ رفع یدین کے ثبوت کی احادیث کے راوی حضرت عبداللہ بن عمر جیسے صحابی ہیں جو اس وقت بچے تھے اور بچہ ہونے کی وجہ سے پچھلی صفوں میں کھڑے ہوتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز کی حرکات وسکنات کو اچھی طرح نہیں دیکھ سکتے تھے۔ لہٰذا بچوں کے مقابل بڑے معمر اور وہ بھی فقیہ مفسر اور اہل علم صحابہ کی بات زیادہ وزنی اور قابل اعتبار ہوگی۔

آیت نمبر (42)

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَیَتَّخِذُ مَا یُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَ صَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَیُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِیْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۹۹﴾ (توبہ)

"کچھ دیہاتی ایسے ہیں جو اللہ اور قیامت پر ایمان لاتے ہیں اور جو خرچ

کرتے ہیں اسے اللہ تعالیٰ کے قرب اور رسول سے دعائیں لینے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یقیناً ان کے لئے باعث قرب ہے۔ اللہ تعالیٰ جلد انہیں اپنی رحمت میں داخل کرے گا اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے"۔

فائدہ

اس آیت مبارکہ میں ایسے لوگوں کی اور ان کے اس فعل کی تعریف کی گئی ہے جو اپنے صدقات وغیرہ لوگوں کو اس لئے دیتے ہیں تا کہ وہ اس عبادت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کریں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعائیں لیں۔ یعنی مسلمان جو اولیائے کرام کی فاتحہ دلاتے ہیں یا ان کے نام کی نذر مانتے ہیں کہ میرا فلاں کام ہو گیا تو غوث پاک کی گیارھویں کروں گا۔ یا فلاں مزار پر چادر چڑھاؤں گا۔ یا فلاں بزرگ کے نام کی دیگ پکا کر کھلاؤں گا تو اس سے مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ یہ خیرات اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اور جب وہ ثواب دے گا تو وہ ثواب اس ولی کی نذر کروں گا تا کہ اس کی روح خوش ہو جائے اور وہ خوش ہو کر ہمیں دعائیں دیں۔ اس آیت مبارکہ سے معلوم ہوا کہ ایسا کرنا شرک یا بدعت نہیں بلکہ درست ہے اور رضائے الٰہی اور اس کے قرب کا باعث ہے۔ کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو میرے قرب اور میرے محبوب کو خوش کرنے اور ان سے دعائیں لینے کے لئے صدقہ کرتا ہے اس کو ضرور میرا قرب ملے گا۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خوش کرنے کے لئے جو صدقہ کیا گیا وہ حرام نہیں ہوا۔ لہٰذا اولیائے کرام کی ارواح کو خوش کرنے کے لئے جو دیگ پکائی جائے گی یا جو کھانا پکا کر تقسیم کیا جائے گا وہ بھی حرام نہیں ہو گا۔ بلکہ وہ یقیناً اس ولی کی خوشی اس کے دعا اور اللہ تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ بنے گا۔ حدیث سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ غیر اللہ کے نام کی منت اور نذر ماننا شرک و بدعت نہیں بلکہ خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اجازت اور رضا اس کے لئے ثابت ہے۔ چنانچہ حدیث پاک میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک غزوہ سے جب بخیریت واپس تشریف لے آئے تو ایک لڑکی نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ میں نے منت مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ آپ کو اس جنگ سے بخیریت واپس لائے

گا تو میں آپ کے سامنے دف بجاؤں گی۔ آپ نے فرمایا اگر تو نے نذر مانی ہے تو اپنی نذر پوری کر لے اور دف بجا لے۔ (مشکوٰۃ باب مناقب عمر) اس حدیث میں لڑکی نے غیر اللہ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دف بجانے کی منت اور نذر مانی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو یہ نہیں فرمایا کہ تو نے شرک کر دیا بلکہ اس کو پورا کرنے کی اجازت دے دی۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے کسی کی منت اور نذر مانی اس نیت سے کہ اس کا ثواب اس کو بھیجے گا یا وہ خوش ہو کر مجھے دعا دے گا تو یہ بالکل جائز ہے۔ ہاں البتہ ایک نذر شرعی ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ کام میں اس کے لئے عبادت سمجھ کر کروں گا۔ یہ نذر صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہوتی ہے اور کسی کے لئے جائز نہیں۔ اگر کوئی اس معنی میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی بھی ولی کی نذر مانتا ہے تو وہ مشرک ہو جائے گا۔ لیکن ظاہر ہے اولیاء کے لئے جو عام مسلمان نذر اور منت مانتے ہیں ان کے وہم و گمان میں دور دور تک اس وقت یہ بات نہیں ہوتی کہ وہ معاذ اللہ اس ولی کو اللہ سمجھ کر اس کی عبادت کے لئے یہ کام کر رہے ہیں۔ لہٰذا یہ نذر شرعی نہیں ہوگی بلکہ نذر عرفی کہلائے گی اور اسی طرح ہوگی جیسے کوئی کسی آدمی سے کہ اگر آپ نے میرا یہ کام کرا دیا تو میں آپ کو اتنے پیسے نذر کروں گا جس طرح یہ کہنا جائز ہے اسی طرح اولیائے کرام کے لئے بھی نذرانہ اور ثواب کے ہدیہ کے طور پر نذر ماننا درست اور صحیح ہے اور قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ ہاں البتہ مشرکین عرب اپنے جانوروں اور کھیتوں میں سے کچھ حصہ اپنے بتوں کے لئے علیحدہ نکال لیتے تھے اور ان کی نذر کو شرعی مانتے تھے یعنی ان کی عبادت کی نیت سے وہ حصہ ان کے نام کے ساتھ مختص کر دیا کرتے تھے۔ اس کی قرآن نے...... وجعلوا للہ ممتا ذرا من الحرث...... فرما کے مذمت کی اور اس کو شرک بتایا۔ لیکن ظاہر ہے مسلمان اپنے نبیوں اور ولیوں کے لئے اس قسم کی نذر نہیں مانتے۔ بلکہ وہ جو کچھ صدقہ و خیرات کرتے ہیں وہ عبادتِ اللہ کے لئے ہے لیکن ثواب اس ولی کو پہنچاتے ہیں اور یہ جائز ہے۔

☆☆

آیت نمبر (43)

قَدۡ خَسِرَ الَّذِیۡنَ قَتَلُوۡۤا اَوۡلَادَهُمۡ سَفَهًۢا بِغَیۡرِ عِلۡمٍ وَّحَرَّمُوۡا مَا
رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افۡتِرَآءً عَلَی اللّٰهِ ؕ قَدۡ ضَلُّوۡا وَمَا كَانُوۡا مُهۡتَدِیۡنَ ﴿۱۴۰﴾

”بے شک تباہ ہوئے وہ لوگ جنہوں نے اپنی اولاد کو نادانی اور جہالت سے قتل کر ڈالا اور اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے رزق کو حرام کرلیا۔ اللہ تعالیٰ پر تہمت لگاتے ہوئے بے شک وہ گمراہ ہوئے اور وہ ہدایت یافتہ نہیں ہیں“۔(الانعام)

فائدہ

اس آیت مبارکہ اور اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفار اور مشرکین کا عقیدہ بیان کیا اور پھر ان کی تردید کی۔ فرمایا کہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ اپنے جانوروں اور کھیتوں میں سے کچھ حصہ اپنے بتوں کے نام پر نکال لیا کرتے تھے اور پھر اس حصہ کو کھانا حرام سمجھتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ جو کھانا وغیرہ ہم نے بتوں کے نام پر کر دیا ہے اس کا کھانا فلاں فلاں کو جائز نہیں۔ اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اس کی تردید فرمائی اور فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ پر بہتان اور تہمت ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو حرام نہیں کیا تو تم کیسے کہتے ہو کہ یہ چیزیں حرام ہوگئیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن جانوروں پر یا جن کھانوں پر بتوں کا نام عبادت سمجھ کر لے لیا جائے یا بتوں کی نذر مان لی جائے اگرچہ یہ فعل شرک ہے لیکن ان کے اس فعل کی وجہ سے وہ کھانا حرام نہیں ہوتا بلکہ مسلمانوں کو اس کا کھانا جائز ہے۔ علمائے کرام فرماتے ہیں کہ آج بھی کافر سانڈ وغیرہ بتوں کے نام پر چھوڑتے ہیں مسلمانوں کو اس کا ذبح کر کے کھانا جائز ہے اس آیت سے یہ مسئلہ بھی ثابت ہوگیا کہ جب کسی جانور یا کھانے پر مکمل شرک کرتے ہوئے بتوں کا نام بطور عبادت لیا جائے اور بتوں کی ان پر نذر مانی جائے تب بھی وہ جانور اور کھانا مسلمانوں کے لئے حرام نہیں ہوتا تو جس فاتحہ کے کھانے پر حضور ﷺ کا یا غوث پاک کا یا کسی ولی اور بزرگ کا نام لے دیا جائے یا کسی جانور پر کسی بزرگ کی نذر مان لی جائے تو اس کا کھانا بھی مسلمانوں کے لئے حرام نہیں ہوگا جب کہ یہاں تو اس

جانوریا کھانے پر بطور شرک کے یعنی اس نبی یا ولی کو معبود سمجھ کر اس کی عبادت کے لئے یہ چیزیں اس کے نام پر مختص نہیں کی جاتیں۔ بلکہ یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہوتی ہیں اور اس کا ثواب ان نبیوں، ولیوں کو پہنچانا مقصود ہوتا ہے تو اس کے حرام ہونے کی تو کوئی وجہ ہی نہیں بنتی۔ جب بتوں کے نام والی چیزیں حرام نہیں ہوتیں تو اولیاء کے نام والی چیزیں کیسے حرام ہو جائیں گی۔ پہلے حدیث گزر چکی ہے کہ حضرت سعد نے ایک کنواں اور اس کا پانی اپنی ماں کے لئے وقف کیا اور اس پر اپنی ماں کا ذکر کیا لیکن وہ پانی حرام نہیں ہوا۔ کیونکہ ان کا مقصد بھی یہی تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اور اس کا ثواب میری ماں کو پہنچے۔ آج بھی فاتحہ وغیرہ میں مسلمانوں کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ اس کھانے وغیرہ کا صدقہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہوتا ہے اور ثواب اس نبی یا ولی کو بھیجا جاتا ہے تو نہ اس عمل میں کوئی خرابی ہے اور نہ اس عمل کے باعث وہ کھانا حرام ہوتا ہے۔

قرآن میں ایک مقام پر آتا ہے...... اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ...... اللہ نے تم پر یہی چیزیں حرام کی ہیں۔ مردار اور سور کا گوشت اور وہ جانور جو غیر خدا کے نام پر ذبح کیا جائے۔ اس آیت میں "وما اهل به لغير الله" کے لفظ سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ پیدا ہو جائے کہ جس چیز پر غیر اللہ کا نام لے دیا جائے وہ حرام ہو جاتا ہے۔ لہٰذا کھانے پر غوث کا نام لیا گیا تو کھانا حرام ہو جائے گا۔ یاد رکھئے "وما اهل به لغير الله" کے یہ ہرگز معنی نہیں کہ جس چیز پر غیر اللہ کا نام لیا جائے وہ حرام ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس جانور پر ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام لیا جائے وہ حرام ہو جاتی ہے۔ لہٰذا کسی جانور پر ذبح کے علاوہ یا کسی کھانے پر کسی غیر خدا کا کتنا ہی نام کیوں نہ لیا جائے وہ کھانا حرام نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ اوپر والی آیت سے ثابت ہو گیا کہ بتوں کا بطور عبادت کے بھی اگر نام لے دیا جائے تب بھی وہ جانور حرام نہیں ہوتا بلکہ اس کا کھانا مسلمانوں کے لئے جائز ہے۔ "وما اهل به لغير الله" کے یہ معنی کرنے کہ جس پر غیر خدا کا نام آ جائے وہ حرام ہو جاتا ہے۔ یہ عقل کے بھی خلاف ہے۔ کیونکہ ہزاروں چیزوں پر غیر

خدا کا نام آتا ہے جیسے دریائے سندھ کا پانی، زید کی بیوی، حامد کا بکرا، خالد کا کھانا، ناصر کا کرتا، فاخر کا پاجامہ وغیرہ اس طرح تو پھر دنیا میں کوئی چیز بھی جائز نہیں رہے گی سب کی سب حرام ہو جائیں گی۔

آیت نمبر (44)

وَجَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةًؕ وَرَهْبَانِیَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَیْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَایَتِهَاۚ فَاٰتَیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْۚ وَكَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ۝۲۷ (حدید)

"اور عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کے دلوں میں ہم نے نرمی اور رحمت رکھ دی اور ترک دنیا کا طریقہ انہوں نے یہ بدعت اپنی طرف سے نکالی تھی ہم نے ان پر مقرر نہیں کی تھی وہاں یہ بدعت انہوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا چاہنے کے لئے نکالی تھی پھر اسے نبھایا نہیں جیسا اسے نبھانے کا حق تھا تو ان کے مومنوں کو ہم نے ان کا ثواب عطاء کیا اور ان میں سے بہت سے فاسق ہیں"۔

فائدہ

اس آیت مبارکہ سے معلوم ہوا کہ دین میں کسی نئی اچھی چیز کا یعنی بدعت حسنہ کا نکالنا برا کام نہیں بلکہ اچھا کام ہے اور باعث ثواب ہے۔ بلکہ اس آیت سے تو یہ بھی ثابت ہو گیا کہ جب کوئی نئی چیز اور اچھی بدعت نکالی جائے تو پھر اس کو چھوڑنا نہیں چاہئے بلکہ اس پر پابندی سے عمل کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں کو ترک دنیا پر یعنی دنیا کو چھوڑ کر غاروں اور پہاڑوں میں بیٹھنے کا ایک نیا طریقہ اور بدعت جو انہوں نے نکالی تھی اس پر ان کو ثواب عطا فرمایا اور جنہوں نے اس نئی اچھی بدعت پر عمل نہیں کیا ان کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا کہ اچھے کام نہ کر کے وہ فاسق ہو گئے۔ لہٰذا اس آیت سے ثابت ہوا کہ ہر نئی چیز اور ہر بدعت بری نہیں ہوتی بلکہ بعض بدعت حسنہ (اچھی بدعت) ہوتی ہیں اور بعض بدعت

سیئہ (بری بدعت) ہوتی ہیں۔ دین میں ایسی نئی چیزیں پیدا کر لینا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی رضا کے لئے ہوں اور دین کے خلاف نہ ہوں وہ اچھی بدعتیں کہلاتی ہیں۔ ان بدعتوں کو نکالنے والے اور ان پر عمل کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ ثواب عطا فرماتا ہے اور ان پر عمل کرنے اور ان کو نبھانے کا حکم دیتا ہے اور دین میں جو باتیں اور بدعتیں ایسی پیدا کر لی جائیں جو دین کے خلاف ہوں اور سنت کو مٹانے اور دین کو بدلنے والی ہوں تو ایسی بدعتیں بدعت سیئہ کہلاتی ہیں۔ ان بدعتوں کو نکالنے والے اور ان پر عمل کرنے والے سب اللہ تعالیٰ کے سخت ترین عذاب کے مستحق ہوں گے۔ (اشعۃ اللمعات باب الاعتصام)

آنحضرت ﷺ کی احادیث سے بھی قرآن کے اس ارشاد کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ ایجاد کیا اور بدعت حسنہ نکالی پھر اس پر عمل بھی کیا گیا تو جتنا اجر و ثواب اس بدعت پر عمل کرنے والوں کو ہوگا اتنا ہی ثواب اس بدعت اور نئے طریقہ کے ایجاد کرنے والے کو بھی ہوگا اور عمل کرنے والوں کے اجر میں ذرا برابر کمی نہیں کی جائے گی اور جس نے اسلام میں کوئی برا طریقہ ایجاد کیا پھر اس کے بعد اس پر عمل بھی کیا گیا تو جتنا گناہ اس بری بدعت پر عمل کرنے والوں کو ہوگا اتنا ہی گناہ اس کے ایجاد کرنے والے کو بھی ہوگا اور عمل کرنے والوں کے گناہ میں ذرا برابر کمی نہیں کی جائے گی۔ (صحیح مسلم جلد دوم ص 431) اسی طرح ایک اور حدیث مبارک میں حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ جس نے ہمارے دین میں کوئی ایسا طریقہ نکالا جو دین میں سے نہیں وہ مردود ہے۔ (مشکوٰۃ باب الاعتصام) حضور ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ ہر نیا طریقہ برا ہے بلکہ فرمایا جو نیا طریقہ ہمارے دین کے خلاف ہو وہ برا ہے۔ معلوم ہوا کہ دین میں ہر نئی چیز کا نکالنا اور ہر بدعت حرام اور ناجائز نہیں بلکہ وہ بدعتیں اور وہ نئی چیزیں جس کا دین میں سے کوئی ثبوت نہ ہو، بلکہ دین کے خلاف ہو اور جس سے کوئی سنت مٹ جاتی ہو اس بدعت کا نکالنا اور اس پر عمل کرنا حرام اور گناہ ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہر نئی چیز جو دین میں نکالی جائے وہ حرام ہے کیونکہ حضور ﷺ

نے فرمایا ''کل بدعة ضلالة'' کہ ہر بدعت گمراہی ہے۔ان کا یہ کہنا درست نہیں اور نہ اس حدیث کے یہ معنی ہیں۔ کیونکہ اگر ان کا یہ کہنا درست ہو اور حدیث کے یہ معنی ہوں کہ ہر نئی چیز حرام اور گمراہی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں کی دین میں نکالی ہوئی ان کی نئی چیز پر کیوں تعریف کی اور کیوں ثواب ان کو عطا فرمایا اور اوپر بیان کردہ حدیث میں حضور ﷺ نے یہ کیوں فرمایا کہ جو نئی اچھی چیز نکالے گا اس کو ثواب ملے گا۔معلوم ہوا کہ اس حدیث کے معنی یہ نہیں بلکہ معنی یہ ہیں کہ دین میں جو بری چیز نکالے گا وہ گمراہی ہے اور وہ حرام کام ہے۔ اسی طرح اگر ان کا یہ کہنا درست ہو کہ ہر نئی چیز اور ہر بدعت حرام ہے تو پھر تو بہت سی ایسی چیزیں جو دین میں نئی نکالی گئی ہیں اور سب ان کو اچھا سمجھتے ہیں اور ان پر عمل کر رہے ہیں وہ سب حرام ہو جائیں گی۔ مثلاً قرآن کے اعراب، رکوع، خوبصورت جلدیں، مساجد کے مینار، دینی مدارس میں مخصوص کتابوں کی تدریس، اوقات تدریس کا تعین، سالانہ ششماہی امتحانات، حدیث کی قسمیں بیان کرنا، بلکہ اصول تفسیر، اصول حدیث، اصول فقہ کے قواعد و ضوابط، سحری کے وقت روزہ کی زبان سے نیت کرنا، ہوائی جہازوں کے ذریعہ سفر حج اور عمرہ کرنا، تصوف کے چاروں سلسلے نقشبندی قادری چشتی سہروردی یہ سب چیزیں حضور ﷺ اور تابعین کے زمانہ میں موجود نہیں تھیں۔ یہ سب دین میں نئی چیزیں پیدا کی گئی ہیں اگر دین میں پیدا کی گئی ہر نئی چیز حرام ہو تو یہ سب حرام ہو جائیں گی۔ حالانکہ ان کو کوئی حرام نہیں کہتا بلکہ یہ سب لائق اجر و ثواب ہیں۔ اسی طرح میلاد شریف کے جلسے جلوس، گیارھویں، بارھویں، معراج شریف، عرس بزرگان دین کی محفلیں، فاتحہ، ختم، تیجہ، چالیسواں، دسواں، چہلم، ایصال ثواب، قبر پر اذان، شب برات میں حلوؤں پر فاتحہ، اذان سے پہلے یا بعد میں درود شریف پڑھنا اور اس جیسے بہت سے نیک کام جو اگر حضور ﷺ کے زمانہ میں اس ہیئت اور طریقہ کے ساتھ نہیں بھی تھے اور بعد میں لوگوں نے ایجاد کر لئے ہیں تب بھی یہ حرام اور ناجائز نہیں۔ بلکہ اسی طرح جائز اور لائق ثواب ہیں جس طرح علم اصول حدیث اور اصول فقہ اور قرآن کے پاروں پر رکوع اور اعراب لگانا یا مدارس قائم کرنا جائز اور لائق ثواب

ہے۔ کیونکہ قرآن وحدیث اور عقل ونقل سے ثابت ہو چکا کہ ہر وہ نئی چیز اور بدعت حرام ہے جو دین کے خلاف ہو اور سنت کو مٹانے والی ہو۔ جب کہ یہ تمام چیزیں نہ دین کے خلاف ہیں اور نہ سنت کو مٹانے والی ہیں بلکہ غور کیا جائے تو اس میں سے اکثر چیزیں سنتوں کو قائم اور تازہ کرنے والی ہیں۔ لہٰذا قرآن وحدیث کی رو سے نہ صرف یہ کہ یہ جائز ہوں گی بلکہ لائق ثواب ہوں گی اور قرآن کے ارشاد کے مطابق تو جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ان نئی اچھی بدعتوں کو نبھانا چاہیے۔ اس کو چھوڑنا نہیں چاہیے۔ بلکہ ان پر پابندی سے عمل کرنا چاہیے۔ ان پر عمل کرنے والے قرآن کی رو سے اللہ تعالیٰ کے محبوب اور پسندیدہ بندے ہیں اور عمل نہ کرنے والے ناپسندیدہ اور فاسق لوگ ہیں۔

☆☆

آیت نمبر (45)

وَالَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰیَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۹۱﴾ (انبیاء)

"اور یاد کرو اس خاتون کو جس نے محفوظ رکھا اپنی عصمت کو پس ہم نے پھونک دیا اس میں اپنی روح اور ہم نے اسے اور اس کے بیٹے کو سارے جہان کے لئے (اپنی قدرت کی) نشانی بنا دیا"۔

فوائد

اس آیت مبارکہ سے کئی فائدے حاصل ہوئے۔ ☆ پہلا فائدہ تو یہ حاصل ہوا کہ اس آیت کے تحت مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پھونک مارنے سے اور سانس لینے سے پاک ہے۔ دراصل حضرت جبریل علیہ السلام نے حضرت مریم علیہا السلام کو پھونک ماری تو وہ حاملہ ہو گئی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسا عظیم نبی ان کے پیٹ سے پیدا ہوا تو دراصل پھونک ماری جبریل نے اور یہ فعل تھا جبریل کا لیکن اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس فعل کو اپنی طرف نسبت دے کے فرمایا کہ ہم نے پھونک ماری۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو اللہ تعالیٰ

کے مقبول بندے فنافی اللہ کے مقام پر فائز ہو جاتے ہیں۔ان کا کام پھر اللہ کا کام ہوتا ہے ان کا فعل اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے ان کی منشاء اللہ تعالیٰ کی منشا ہوتی ہے ان کا دیکھنا اللہ تعالیٰ کا دیکھنا ہوتا ہے۔اسی چیز کو متعدد مقامات پر قرآن میں بیان کیا گیا۔اپنے محبوب کے لئے اللہ تعالیٰ نے کہیں فرمایا کہ جس نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کے ہاتھ پر بیعت کی (سورہ فتح) کہیں فرمایا کہ آپ نے جب کنکریاں پھینکیں تو آپ نے نہیں پھینکیں بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ نے پھینکیں (انفال آیت 17) حدیث قدسی میں اس مقام کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جب میرا بندہ نوافل کے ذریعہ میرا محبوب بن جاتا ہے تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے میں اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے میں اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے میں اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔

(صحیح بخاری بحوالہ مشکوۃ کتاب الدعوۃ باب ذکر اللہ والتقرب الیہ)

ظاہر ہے اللہ تعالیٰ تو جسم سے پاک ہے وہ بندہ کے آنکھ، کان، ہاتھ، پیر بن جاتا ہے اس کا کیا مطلب......؟ تو اس کے معنیٰ یہی ہیں کہ کان اس کے ہوتے ہیں لیکن اس میں بھی طاقت خدا کی آجاتی ہے۔اسی طرح آنکھ، ہاتھ، پیر بندے کے ہوتے ہیں لیکن اس میں طاقت خدا کی آجاتی ہے اور اس کے وہ افعال پھر خدا کی طرف منسوب ہو جاتے ہیں اور جب وہ سننا، دیکھنا خدا کا ہوا تو پھر خدا سے کوئی چیز مخفی نہیں۔دور و نزدیک کی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں۔یہی وجہ ہے کہ پھر اولیاء کرام بھی دور و نزدیک یکساں دیکھتے ہیں اور سنتے ہیں اور فاصلے ان کے سامنے سمٹ جاتے ہیں اور جس طرح وہ قریب پہنچ کر مدد کر سکتے ہیں۔اسی طرح دور بھی پہنچ کر مدد کر سکتے ہیں۔کیونکہ اب ان کے ہاتھوں پیروں میں خدا کی طاقت آگئی ہے اور ان کا فعل خدا کا فعل ہو گیا ہے۔لہٰذا اب اولیاء کے کسی فعل پر اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔یہ کہنا کہ وہ کچھ نہیں سنتے، کچھ نہیں دیکھتے، کچھ نہیں دے سکتے، کچھ نہیں کر سکتے، کسی کو نفع نقصان نہیں پہنچا سکتے، یہ دراصل اب ان کے فعل پر اعتراض نہیں بلکہ

اللہ تعالیٰ کے فعل پر اعتراض ہے۔ یہ ان کی توہین نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی توہین ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو میرے اولیاء سے عداوت رکھے وہ مجھ سے جنگ کے لئے تیار ہو جائے۔ (بخاری بحوالہ مشکوٰۃ ص 197) لہٰذا اولیاء کی توہین اور گستاخیاں کر کے اللہ تعالیٰ سے جنگ اور اس کی دشمنی مول نہیں لینی چاہیئے۔

☆ دوسرا فائدہ اس آیت سے یہ حاصل ہوا کہ حضرت جبریل کے دم سے حضرت بی بی مریم حاملہ ہو گئیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ دم، درود جھاڑ پھونک بڑا اثر رکھتے ہیں اور بہت فائدہ پہنچاتے ہیں۔ لہٰذا اولیائے کرام جو دم درود اور جھاڑ پھونک اور تعویز وغیرہ کے ذریعہ جو روحانی علاج کرتے ہیں وہ شرک و بدعت نہیں اور نہ ہی توحید کے خلاف ہے۔ بلکہ حضرت جبریل علیہ السلام کی سنت ہے اور اس سے مرادیں بر آتی ہیں اور مشکلیں آسان ہوتی ہیں اور بیماروں کو شفائیں ملتی ہیں۔ بلکہ اگر دیکھا جائے تو خود حضور ﷺ کی اور صحابہ کی سنت ہے۔ کیونکہ پھوڑے پھنسی کی ایک دعا حضرت جبریل نے حضور ﷺ کو آ کر بتائی اور حضور ﷺ نے اس کو پڑھ کر جھاڑا تو حضور کو شفاء حاصل ہو گئی (مسلم ص 289) صحابہ کی بھی یہ سنت ہے۔ چنانچہ بخاری شریف میں صحیح حدیث ہے کہ کچھ صحابہ کرام ایک سفر پر جا رہے تھے۔ راستے میں ایک مقام پر کسی قبیلہ کے سردار کو بچھو نے کاٹ لیا۔ انہوں نے ان صحابہ سے کہا کہ آپ کے پاس اس کا کوئی علاج ہے تو ایک صحابی نے کہا کہ ہاں میرے پاس ہے بشرطیکہ تم مجھے اس کا معاوضہ دو۔ چنانچہ معاوضہ میں کچھ بکریاں دینی طے ہو گئیں اور ان صحابی نے سور فاتحہ پڑھ کر جب اس سردار پر دم کیا تو وہ اسی وقت شفایاب ہو گیا۔ جب ان صحابہ کو بکریاں ملیں تو انہوں نے کہا کہ جب تک ہم حضور ﷺ سے اس کے متعلق دریافت نہیں کر لیں گے اس وقت تک ان بکریوں کو آپس میں تقسیم نہیں کریں گے۔ جب یہ سب حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ بیان کیا تو آپ نے فرمایا تم نے صحیح کیا اور مسکراتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ ان بکریوں میں ہمارا حصہ بھی رکھ لینا۔

(صحیح بخاری، کتاب الاجارہ، باب ما یعطی فی الرقیۃ جلد دوم ص 304)

اس سے ثابت ہوا کہ دم درود اور جھاڑ پھونک شرک و بدعت نہیں بلکہ حضور ﷺ اور صحابہ کرام کی سنت ہیں اور اس پر حضور ﷺ کی مہر تصدیق بھی موجود ہے اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ دم، درود اور تعویز وغیرہ پر معاوضہ لینا بھی جائز ہے۔

اب بعض روایات میں جھاڑ پھونک اور دم درود اور تعویذ گنڈے وغیرہ سے جو منع کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے اس سے مراد وہ جھاڑ پھونک اور تعویذ ہیں جو شرکیہ اور کفریہ الفاظ اور منتر وغیرہ پر مشتمل ہوں۔ لیکن قرآنی آیات احادیث یا کسی اچھے دینی کلام کو پڑھ کر جو دم، درود کیا جاتا ہے وہ اس سے مراد نہیں۔ کیونکہ اگر ہر قسم کا دم درود شرک اور کفر ہوتا تو حضرت جبریل دم کیوں کرتے پھر حضور اکرم ﷺ صحابہ کو ایسے مشرکانہ کام کی اجازت کیوں دیتے اور ایسے حرام اور شرکیہ کام کے ذریعہ جو حرام کی آمدنی ہوئی تھی اس میں مسکرا کر حضور ﷺ اپنا حصہ رکھنے کے لئے کیوں فرماتے۔ اس سے ثابت ہوا کہ شرکیہ کلمات پر مبنی دم، درود اور تعویذ حرام ہے اور غیر شرکیہ کلام پر مبنی دم درود اور تعویذ نہ شرک ہے نہ حرام بلکہ جائز ہے اور حضرت جبریل اور صحابہ کی سنت ہے۔

ڈاکٹر صاحبزادہ ابوالخیر محمد زبیر کی تصانیف

درسِ حدیث | درسِ قرآن

بزمِ جاناں | کربلا کا ستارہ

جدید شرعی مسائل | مصباح العقائد

امام ربانی اور اتباعِ رسولِ گرامی ﷺ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

- گنج بخش روڈ، لاہور 37221953-37220479
فیکس: 37238010
- 9، الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور 37225085-37247350
- 14، انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی 32630411-32212011
فیکس: 32210212

تعارف

قبلہ ڈاکٹر صاحبزادہ ابوالخیر محمد زبیر دامت برکاتہم العالیہ ۱۸ رجب المرجب ۱۳۷۱ھ کو شہر حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔

قبلہ صاحبزادہ صاحب نے علوم عربیہ کی ابتداء سے انتہا تک اہم اور ادق ترین کتب رکن الاسلام جامعہ مجددیہ میں (والد گرامی قبلہ مفتی صاحبؒ) کے سائے میں وہ کر پڑھیں جن کا علوم ظاہری و باطنی میں سکہ مسلم تھا اور ساتھ ساتھ (Board of Intermediate and Secondary Education Hyderabad) اور سندھ یونیورسٹی کے تحت مولوی عربی، مولوی عالم، فاضل، میٹرک، انٹر، بی۔اے، کے امتحانات حیدر آباد میں نمایاں نمبروں سے پاس کر کے عصری علوم میں بھی مہارت حاصل کرتے رہے۔

دو سال مسلسل ملک المدرّسین استاذ الاساتذہ علامہ عطا محمد بندیالوی کی خدمت میں رہ کر معقولات میں ملا حسن، خیالی، میر زاہد، غلام یحییٰ، مسلم الثبوت جیسی وہ ادق کتابیں پڑھیں اور استاذ کی ان نفیس تقریروں سے اپنی نظر و فکر کو روشن و مستنیر کیا کہ پھر علمی میادین میں جس سمت بھی رخ کرتے سکے بٹھا دیتے۔ آپ نے جب میدان تصنیف میں "حق نبی" اور "مغفرت ذنب" جیسے علمی و تحقیقی معرکۃ الآراء مسائل کی طرف رخ کیا تو دلائل کے وہ انبار لگائے، قرآن وحدیث کے متون اور نصوص سے ایسے نکات اخذ کرتے کہ قائد ملت اسلامیہ علامہ شاہ احمد نورانیؒ استاذ العلماء علامہ عطا محمد بندیالویؒ مفسر قرآن جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ، رئیس المحققین علامہ اشرف سیالوی، علامہ حسن حقانی، پروفیسر منیب الرحمٰن سمیت بے شمار علماء مشائخ صرف آپ کے کلام کی تصدیق وتائید ہی نہیں کرتے بلکہ حاسدوں کے حسد اور ان کے مکر و فریب سے محفوظ رہنے کیلئے بارگاہ رب العزت میں دعا کیلئے ہاتھ اٹھا دیتے، خاص طور پر "حق نبی" کے مسئلہ میں قبلہ صاحبزادہ والاشان نے جب اعلیٰ حضرت کے پوتے جناب مولانا اختر رضا خان بریلوی سے علمی مباحثہ کیا تو شاید ہی پاکستان کا کوئی بڑا عالم، فقیہ یا شیخ ہو جنہوں نے آپ کے کلام کی تصدیق وتائید نہ کی ہو۔

آپ کی اس علمی شان و شوکت، خاندانی وجاہت اور میدان عمل میں اخلاص ومحبت کو دیکھتے ہوئے ہر تنظیم میں خواہ جماعت اہلسنّت ہو، جمعیت علماء پاکستان ہو، تنظیم المدارس ہو، متحدہ مجلس عمل ہو، کمیٹیاں برائے امن واتحاد ہوں، اسٹینڈنگ کمیٹیاں ہوں، غرض سیاسی تنظیمیں ہوں یا مذہبی جماعتیں ہوں قبلہ صاحبزادہ والاشان کی قیادت ومرکزیت ناگزیر ہے، یہی وجہ ہے علامہ شاہ احمد نورانی صدیقیؒ کے وصال کے بعد نظام مصطفیٰ ﷺ کیلئے جدوجہد کرنے والے قافلے کی قیادت کیلئے چار سال دنیا بھر میں ڈھونڈنے کے بعد اگر قیادت کا سہرا کسی کے سر سجایا گیا تو وہ قبلہ ڈاکٹر صاحبزادہ ابوالخیر محمد زبیر دامت برکاتہم العالیہ کی ذات گرامی ہے۔ ان تمام مصروفیات کے ساتھ ساتھ ۱۹۹۴ء میں ہی آپ نے "سندھ کے صوفیائے نقشبند" پر ایک شاندار تحقیقی مقالہ تحریر فرما کر ڈاکٹریٹ جیسی دنیاوی تعلیم کی انتہائی ڈگری حاصل کی اور روحانیت کی اعلیٰ ترین ڈگری "اجازت وخلافت" اپنے والد گرامی کی صحبت میں رہ کر حاصل کی۔ آپ کی انہی نسبتوں اور روحانی مقامات ومراتب کو دیکھتے ہوئے عالم عرب وعجم کی مستند ومعتمد علیہ ہستی سید محمد علوی مالکیؒ نے آپ کو انتہائی محبتوں اور شفقتوں کے ساتھ معقولات ومنقولات اور روحانیت کے سلسلوں کی وہ تمام خصوصی اجازت عطاء فرمائیں جو ان کو عرب کے بلند پایہ مفسرین محدثین وصوفیاء سے خصوصی طور پر حاصل ہوئی تھیں۔